معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۲ ماہ جمادی الآخر ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۸ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات

گزشتہ ماہ ان صفحات میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ بد قسمت افغانستان کو روس سے گلو خلاصی کے بعد بھی امن و امان نصیب نہیں ہوا بلکہ خانہ جنگی سے وہ مزید تاراج ہوتا جارہا ہے، تعجب اس پر ہے کہ افغانستان میں ہونے والی خوں ریزی و سفاکی میں کمیونسٹوں اور روس نوازوں کی طرح اسلام کے حامی اور فدائی بھی شریک ہوگئے تھے، اس بحرانی اور پرآشوب دور میں طالبان سامنے آئے اور تائید غیبی سے افغانستان پر ان کا قبضہ ہوگیا، یہ گو اسلام کا نام لیتے ہوئے معرکے میں داخل ہوئے تھے مگر انہیں امریکی ایجنٹ کہہ کر بدنام کیا گیا۔ اب امریکہ اور غیر مسلم ملکوں کو توان سے پرخاش ہے ہی، کئی مسلم ممالک بھی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور افغانستان کو اب بھی حالت جنگ ہی میں رکھنا چاہتے ہیں ان ہی کے زیر اثر طالبان کے اصل حریف خواہ وہ روس کے حاشیہ بردار ہوں یا اسلام کے نام نہاد فدائی طالبان کے خلاف ناروا پروپگنڈے کر رہے ہیں۔

طالبان کی سخت گیری، شدت پسندی اور ناتجربہ کاری قابل شکایت ہو سکتی ہے لیکن اس کو اور اسی طرح کی بعض دوسری چیزوں کو ان کی مخالفت کے لیے جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ اسلامی ممالک یا افغانستان میں خانہ جنگی برپا کرنے والے خود وہی ہیں کے لوگ امریکہ اور ان مغربی ملکوں کے جو اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے تلے ہوئے ہیں، آلۂ کار بن کر ان کے لیے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں، زیادہ قلق اس کا ہے کہ "اسلامی انقلاب" والا ایران افغانستان کی سرحد پر مسلسل جنگی مشقیں کر رہا ہے بلکہ محمد خاتمی نیویارک سے واپسی کے بعد فوجی کارروائی کی دھمکی بھی دے رہے ہیں، ایران کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ امریکہ اسے کتنا تنگ کرتا رہا ہے اور افغانستان اس کا پڑوسی ہی نہیں برادر ملک بھی ہے طالبان کے افغانستانی

مخالفوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکومت و اقتدار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہتا ہے اسے یہ دے دیتا ہے اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ اس لیے سب کو اس فیصلہ پر جو طالبان کے حق میں ہوا ہے راضی ہوجانا چاہیے اور جنگ کو طول دے کر اپنی بدبختی اور اسلام کی رسوائی کا موجب نہیں بننا چاہیے!

اگست اور ستمبر کے مہینے میں ملک کی کئی ریاستوں کے بیشتر علاقے زیر آب ہوگئے تھے اور جو تباہی و بربادی آئی وہ ناقابل بیان ہے، ہزاروں جانیں تلف ہوئیں، مویشی بہہ گئے، درخت اکھڑ گئے، کھیتیاں تباہ ہوگئیں، آبادیاں ویرانوں میں، راستے اور سڑکیں گڈھوں میں تبدیل ہوگئیں اور آمد و رفت اور نقل و حمل کے ذرائع بند ہوگئے، طوفان ختم ہونے کے بعد وبائی بیماریاں پھوٹ پڑیں، ضرورت کی چیزیں اور غذائی اجناس نایاب ہیں، لوگ پینے کے پانی کو ترسنے لگے، طبی سہولتیں اور دوائیں میسر نہیں۔ ایسے ستم رسیدہ اور آفت زدہ لوگ کس قدر ہمدردی و اعانت کے مستحق ہیں لیکن انکی قوم ان کے ملک اور ان کے بھائیوں کی سنگ دلی کتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ان کی تباہی و مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، امدادی رقوم و عطیات انہیں پہنچانے کے بجائے اپنی جھولیوں میں ڈالے جارہے ہیں، اہل سیاست سیاسی فائدے اٹھانے کی فکر میں ہیں، حکمرانوں کو جوڑ توڑ سے فرصت نہیں، وہ جتنا کرتے نہیں اس سے کئی گنا زیادہ پروپگنڈا کرتے ہیں، حالانکہ ان کی دی ہوئی رقوم کا عشر عشیر بھی ان کو نہیں ملتا۔

ان واقعات و حوادث میں بڑی عبرت و بصیرت پنہاں ہوتی ہے لیکن انسان کی ظاہر بینی اور سطحیت پسندی اسے ان کے مادی پہلوؤں سے آگے نہیں بڑھنے دیتی، ظاہری ہلاکت اور نقصان کے اعداد و شمار میں الجھا کر ان کے روحانی اثرات و نتائج کو اوجھل کر دیتی ہے، اس لیے اس کی غفلت، بے خبری اور مدہوشی میں کوئی کمی نہیں آتی، حالانکہ قرآن مجید ہمیشہ واقعات و حوادث کے عبرتناک

اور سبق آموز پہلوؤں ہی کو نمایاں کرتا ہے، سورۂ نور میں کہا گیا ہے "اللہ تعالیٰ آسمان کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے تو جس پر چاہتا ہے ان کو پہنچا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ان کو ہٹا دیتا ہے اس کی بجلی کی چمک قریب ہے کہ آنکھوں کی روشنی اچک لے، اللہ تعالیٰ رات اور دن کو گردش دیتا ہے، بلاشبہ ان چیزوں میں اہل بصیرت کے لیے عبرتیں ہیں (۲۴: ۴۳ و ۴۴) یہ سیلاب اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تباہیاں بلاشبہ غافلوں اور سرمستوں کے لیے ایک کھلی ہوئی تنبیہ اور زبردست تازیانہ تھا، اگر ہماری چشم عبرت وا ہوتی تو ہم نے اس سے کیا کچھ نہ سبق لیا ہوتا۔

ہندوستان کے صدر جمہوریہ مسٹر کے۔ آر۔ نرائنن قابل مبارکباد ہیں کہ ایسے پر آشوب دور اور بدعنوانیوں سے گھرے ہوئے سیاسی ماحول میں بھی وہ بے لاگ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ کرنے میں نہ برسر اقتدار پارٹی کے دباؤ میں آئے اور نہ اس کی کوئی بے جا رو رعایت کی، بہار میں صدر راج نافذ کرنے کی حکومت کی سفارش واپس کر کے انہوں نے آئین و جمہوریت کا تحفظ کیا ہے اور ملک کی عظمت و وقار میں اضافہ کیا ہے، جہاں ان کا یہ اقدام ہر طرح کی تحسین و آفرین کا مستحق ہے وہاں بہار کے گورنر کا اقدام افسوس ناک اور ملک کی جمہوریت اور اس کے دستور و قانون کی بالادستی کے لیے فال بد ہے اگر گورنر اسی طرح حکمراں پارٹی کے اشاروں پر جانبدارانہ اور غیر منصفانہ کام کریں گے تو اس سے بڑی خرابیاں رونما ہوں گی اور ملک کے آئین و جمہوریت کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ اس واقعہ سے بی۔ جے۔ پی کا غیر جمہوری مزاج بھی کھل کر سامنے آگیا ہے، اس کے بعض وزرا صدر کے فیصلے سے پہلے ہی ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے کہنے لگے تھے کہ وہ دوبارہ پھر سفارش کریں گے، اپنے اس گھناؤنے ارادے سے بی۔ جے۔ پی کو اس لیے باز آنا پڑا کہ اس کے اتحادی خود اس کی تجویز کے مخالف تھے۔ اس لیے اس کو پھوٹ پڑ جانے اور حکومت گر جانے کا خوف پیدا ہو گیا تھا، صدر کے فیصلہ نے بہار اور ان سب ریاستوں کو جن کے حالات بہتر نہیں ہیں، نظم و نسق بہتر بنانے اور اصلاح حال کا موقع دیا ہے۔

مقالات

عالم ربوبیت میں توحید شہودی کے جلوے
اور
اہل اسلام کی ذمہ داریاں

از مولانا شہاب الدین ندوی

(۴)

ابن تیمیہ کے سائنسی اکتشافات

علامہ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) نے مذکورہ بالا اصولوں کو بیان کرنے کے بعد اپنے دور کے بعض سائنسی حقائق یا علمی اکتشافات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو حد درجہ معقول اور دلچسپ ہونے کے علاوہ اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالنے والے ہیں کہ اہل اسلام نے اپنے دور میں کتنی دقت نظر سے مظاہر عالم کے اسباب و علل اور ان کے خواص و تاثیرات دریافت کیے تھے جو آج تک "مقبول عام" دکھائی دیتے ہیں چنانچہ ان حقائق و معارف کا جدید سائنس نے اب تک انکار نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید سائنس آج جو کچھ بھی بیان کر رہی ہے وہ سب قرون وسطیٰ ہی کے علمی اکتشافات کی کاربن کاپی ہے۔ علامہ موصوف نے ان حقائق کو باضابطہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

۱۔ حسی امور کی دو قسمیں ہیں: خاص اور عام۔

(الف) خاص وہ ہے جو صرف شخصی تجربات تک محدود ہو۔

(ب) عام یا مشترک، جو تمام لوگ محسوس کرتے ہوں، جیسے چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھنا وغیرہ۔ یعنی وہ امور جن میں ایک دوسرے کو جھٹلانا ممکن نہ ہو۔

۲۔ تجرباتی امور وہ ہیں جو حواس اور عقل سے حاصل ہوتے ہوں، جیسے پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، گردن کاٹ دینے سے موت واقع ہوجاتی ہے اور مار پڑنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے وغیرہ۔

۳۔ اسی طرح ہمارا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور جب غائب ہوجاتا ہے تو رات کی تاریکی چھا جاتی ہے۔ یہ بھی ہمارا تجربہ ہے کہ سورج جب سمت راس میں دور چلا جاتا ہے تو سردی شروع ہوجاتی ہے اور جب سردی شروع ہوتی ہے تو درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور زمین کا اوپری حصہ ٹھنڈا مگر اس کا اندرونی حصہ گرم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح سورج جب سمت راس میں قریب آجاتا ہے تو گرمی شروع ہوجاتی ہے اور جب گرمی شروع ہوتی ہے تو درختوں کے پتے اور کلیاں نکل آتی ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جن کا علم ہر ایک کو ہے۔ کیونکہ اس تجربے و مشاہدے میں تمام لوگ مشترک ہیں۔

۴۔ جب ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے تو زمین کی سطح اور زمین پر موجود تمام چیزیں ٹھنڈی ہوجاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین پر جو گرمی تھی وہ زمین کے اندر چلی جاتی ہے، اس لیے جوف ارض اور اس میں موجود پانی گرم ہوجاتا ہے (چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ چشموں کا پانی سردیوں میں گرم رہتا ہے)۔

۵۔ اسی وجہ سے حیوانی اجسام کے اندرونی حصے بھی گرم ہوجاتے ہیں اور اس اندرونی گرمی کی بنا پر وہ کھانا بہ نسبت گرمیوں کے زیادہ کھاتے ہیں۔

۶۔ اور جب گرمی آتی ہے تو ہوا گرم ہوجاتی ہے اور زمین کی سطح بھی گرم ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں اس پر موجود ٹھنڈک اندر چلی جاتی ہے۔ لہٰذا زمین کا باطن، حیوانات کے اجواف اور چشمے بھی ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے گرمیوں میں چشموں کا پانی ٹھنڈا رہتا ہے اور حیوانات کے لیے غذا کا ہاضمہ کمزور ہوجاتا ہے۔[1]

یہ قرون وسطیٰ میں دریافت کردہ علمی حقائق کی محض ایک جھلک ہے اور اس قسم کے بے شمار حقائق اس دور کی سائنسی کتابوں کے علاوہ خود علمائے اسلام کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں، جس کے ملاحظہ سے قدیم علمائے اسلام کی بصیرت اور روشن فکری ظاہر ہوتی ہے۔

سائنسی علوم سے چھوت چھات کا نتیجہ

علامہ ابن تیمیہ نے یہ تمام حقائق اور اصول و کلیات اس دور میں بیان کیے ہیں جب کہ معقولات کا غلبہ تھا اور سائنٹفک حقائق "مغلوب" تھے یعنی انہیں "قبول عام" حاصل نہیں تھا۔ بایں ہمہ انہوں نے جو قواعد و ضوابط بیان کیے ہیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور یہ تمام حقائق و معارف موجودہ دور کے علماء کے لیے ایک درس عبرت کی حیثیت رکھتے ہیں جو جدید سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت اور معقولات کی عصر حاضر میں "مغلوبیت" کے بعد بھی اب تک سائنسی حقائق کو تسلیم کرنے اور دینی اعتبار سے ان کے حجت ہونے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ایک چلے چلائے فقرے یا ایک متوارث قول کی بنا پر ان علوم و مسائل پر "تغیر پذیری" کا الزام عائد کرتے ہوئے ان سے کنارہ کش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج سائنسی علوم کو "قبولیت عامہ" حاصل ہوگئی ہے اور آج کوئی بھی پڑھا لکھا اور سمجھ دار

[1] کتاب الرد علی المنطقیین ص ۹۲-۹۵ (مختلف مقامات کا خلاصہ)

آدمی ان علوم و مسائل کی حقیقت و واقعیت میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں کرتا، سوائے ہمارے دیندار طبقے کے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی شک پسندی اور چھوت چھات سے سائنس یا سائنسی علوم کو معتبر ماننے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، بلکہ نقصان صرف ہمارا اور دین شریعت ہی کا ہو سکتا ہے۔

حواس اور عقل کا اعتبار اسلام میں

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے یہ سارے اصول و کلیات قرآنِ عظیم کی روشنی میں اس کی روح کے مطابق مرتب کیے ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے قابلِ حجت ہیں۔ جو لوگ تجربہ و مشاہدہ یا حواس و عقل کو قابلِ حجت نہیں مانتے ان کے خلاف شیخ الاسلام نے قرآن کی بعض آیات سے بالکل انوکھے انداز میں استدلال کیا ہے جو ایک لطیف ترین استدلال ہے اور جو لوگ موجودات عالم کا جائزہ لے کر ان میں موجود حقائق یا خدائی اسباق و بصائر سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے سے جی چراتے ہیں وہ قرآن کی نظر میں بہائم اور چوپائے ہی نہیں بلکہ اندھے اور بہرے ہیں جو کچھ سمجھنے کے لائق ہی نہیں رہ گئے ہیں اور اس بنا پر گویا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور یہ قرآن کی انتہائی سخت آیات ہیں جو تجربہ و مشاہدہ کو قابلِ حجت تسلیم نہ کرنے والوں کے خلاف حجت ہیں۔

شیخ الاسلام کی پیش کردہ آیات ملاحظہ کیجیے[1]

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

سمع و بصر (حواس) اور فواد (عقل) ہر ایک کے بارے میں ضرور باز پرس

[1] یہ پوری تشریح راقم السطور نے خود پیش کی ہے۔ لیکن قرآنی آیات علامہ کی پیش کی ہوئی ہیں۔ جو مذکورہ بالا بحث کے بعد حاصلِ بحث کے طور پر ہیں

(اسراء : ۳۶)

کی جائے گی (کہ انکا استعمال کس طرح ہوا؟)

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (نحل : ۷۸)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے (اس حال میں) نکالا کہ تم کسی چیز کا علم نہیں رکھتے تھے۔ لہذا اس نے (تمہاری سماعت کے لیے) کان (دیکھنے کے لیے) آنکھیں (اور سمجھنے کے لیے) دل بنائے تاکہ تم (ان سے علوم و معارف حاصل کر سکو اور اس کے نتیجے میں) اللہ کا شکر ادا کر سکو[1]

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ

(اعراف : ۱۷۹)

اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور انسان پیدا کیے ہیں، جن کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان تو ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ لہذا یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے۔ یہی لوگ (اللہ سے) غافل ہیں۔

[1] یہ تشریح تفسیر کبیر سے ماخوذ ہے (جلد ۲۰ ص ۹۲)۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعاً وَّاَبْصَاراً وَّاَفْئِدَةً فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ وَلَا اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔

(احقاف: ۲۶)

اور ہم نے انہیں (قوم عاد کو) کان، آنکھیں اور دل دیے تھے، مگر نہ تو انکے کان ہی کام آئے نہ ان کی آنکھیں کام آئیں اور نہ ان کے دل ہی کام آئے (انہوں نے ان میں سے کسی بھی چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا) کیونکہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے رہے اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر آن پڑا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

(بقرہ: ۷)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ

(بقرہ: ۱۸)

یہ تو بہرے، گونگے اور اندھے ہیں جو پلٹ کر نہیں آئیں گے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ۔

(حم سجدہ: ۵)

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں اور تمہاری دعوت کے درمیان (کافی) حجابات ہیں، ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ پڑا ہوا ہے۔

ان تمام آیات میں سمع و بصر کو حواس خمسہ کے دو اہم نمائندوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں حاسے نہ صرف علم اور معلومات کا اصل ذریعہ ہیں بلکہ انہی کی وجہ سے انسان بہائم اور چوپایوں سے ممتاز نظر آتا ہے۔[1]

یہ تمام آیات حواس خمسہ اور عقل کے صحیح استعمال پر زور دے رہی ہیں اور اس حقیقت کو بھی پوری طرح فاش کر رہی ہیں کہ سمع و بصر اور عقل کا اصل مصرف دنیوی عیش و آرام نہیں بلکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو پہچاننا ہے جو معرفتِ الٰہی کا ذریعہ ہیں مگر جو لوگ دنیوی عیش و آرام ہی کو سب کچھ تصور کرکے دل کے اندھے یا "صما مختون" بن جاتے ہیں تو وہ حقائق و واقعات کو جھٹلانے لگ جاتے ہیں۔ لہذا ان کے دلوں پر خود بخود مہر لگ جاتی ہے اور وہ اندھے بہرے بن جاتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی انکی صلاحیت ہی ضایع ہو جاتی ہے۔ انکارِ حق کا جب یہ مرحلہ آجاتا ہے تو کوئی بات ان پر اثر نہیں کرتی بلکہ ان کے قلوب اور دعوتِ حق کے درمیان پردے پڑ جاتے ہیں۔

غرض ان آیات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ حواس خمسہ اور عقل و شعور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جو حصولِ علم کا اصل ذریعہ ہیں، لہذا اپنے خالق و معبود کی پہچان کے لیے ان ذرائع علم کا صحیح اور مکمل استعمال ہونا چاہیے۔ کیونکہ اصل علم اللہ کی معرفت ہی کا علم ہے، جو خدائی مخلوقات و موجودات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے چاروں طرف (آفاق) میں اپنے وجود کی "نشانیوں" کے طور پر بکھیر دیا ہے بہرحال حواس اور عقل کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم قرآنِ عظیم کی نظر میں قابلِ حجت ہے۔ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، نہ شرعی اعتبار سے اور نہ عقلی اعتبار سے ان آیات میں

[1] کتاب الرد علی المنطقیین، ص ۹۰۔

دونوں طبقوں کا رد موجود ہے۔

معرفت الٰہی کے دو مراتب

اس بحث سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ علم تکوین (سائنس) اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے علمی و تجرباتی حقایق یا منطقی نتائج دین و شریعت کی نظر میں حجت ہیں جو معرفت الٰہی کا اصل ذریعہ ہیں۔ نیز دلیل و استدلال کی اصل بنیاد ہیں، جن کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ اس قسم کے علم و معرفت سے غافل ہیں یا انہیں حجت نہیں مانتے وہ اللہ کی نظر میں چوپائے ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع و بصر اور فواد کی قوتوں سے اسی لیے نوازا ہے کہ وہ ان "ذرایع علم" کو کام میں لاکر اپنے خالق و مالک اور معبود حقیقی کو پہچانیں اور عالم شہود کے نظاموں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ ان "ظواہر" کے پس پردہ بیٹھ کر کس حیرت انگیز طریقے سے ان "پتلیوں" کو حرکت دے رہا ہے۔

اس علم کا دوسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ علم تکوین میں گہری بصیرت حاصل ہونے کے بعد اس جہانِ آب و خاک میں چاروں طرف خلاقیت، ربوبیت، رحمانیت اور الوہیت کے جلوے نظر آئیں گے اور ہر سو توحید شہودی کے نظارے ہوں گے، جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ جیسا کہ اس کے متعلق امام اعظم ابو حنیفہؒ کا یہ قول پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی صفات (اور خاص کر اس کی صفت تکوین) کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کائنات اس کی صفت تکوین کا پرتو اور اس کا عکس ہے۔

غرض اس علم کا پہلا درجہ "عالمانہ" اور دوسرا درجہ "متصوفانہ" ہے جو ایک مومن و مسلم کی زندگی کا آئیڈیل ہے۔ یعنی وہ علم الیقین اور عین الیقین کی اس منزل تک ضرور

پہونچے۔ مگر اس مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے لیے ہر مومن و مسلم کو پہلے دلیل و استدلال کی منزل تک پہونچنا پڑے گا جو اس سلسلے کی پہلی منزل اور اس کا پہلا زینہ ہے۔ اس مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے بعد گویا بندہ "معرفت الٰہی" کے اصل مقام کو پالے گا اور پھر اس کی نظروں میں یہ پوری کائنات صفاتِ الٰہی کی جلوہ گاہ نظر آئے گی اور ہر طرف اسے "کمالاتِ الٰہی" کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ گویا کہ وہ مخلوقاتِ الٰہی کو نہیں بلکہ کمالات الٰہی کو دیکھ رہا ہے اور خدائی جمال و جلال کا نظارہ کر رہا ہے۔ اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد بندہ کی زندگی ہی بدل جائے گی اور وہ "شوق دیدار" میں دنیوی زندگی کو ایک قید خانہ محسوس کرنے لگے گا اور دنیا اس کی نظر میں حقیر بن جائے گی۔ لہذا وہ مجسم طاعت بن کر خدائی اوامر و نواہی کا ہر حال میں پابند رہے گا اور شریعت الٰہی کا دامن چھوڑنے پر کسی بھی حال میں راضی نہ ہوگا اس اعتبار سے ہر مومن و مسلم کو عین الیقین اور حق الیقین کی اس منزل مقصود تک پہنچنے کی ضرور کوشش کرنی چاہیے۔

توحید شہودی اور بندہ کی معراج

یہ ایمان کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے جو عند اللہ مطلوب ہے۔ اور اس مشاہدہ سے توحید کی حقیقت آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ یعنی اس مرتبہ پر پہونچ کر توحید "استدلالی" نہج سے آگے بڑھ کر "مشاہداتی" بن جاتی ہے اور اس منزل پر پہونچ جانے کے بعد بندہ "لطف عبودیت" سے سرشار ہو جاتا ہے اور پھر اس کا کوئی بھی قدم معصیت الٰہی کی طرف اٹھ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ خدا کو اپنے سامنے پا رہا ہوتا ہے۔ جس کا وہ "عیاناً" مشاہدہ کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

قال ما الاحسان؟ قال ان — (رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ)

تعبد اللہ کانک تراہ فان — احسان کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا

لم تکن تراہ فانہ یراك۔

کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی
اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے
ہو۔ اگر ایسا کرنا تمہارے لیے ممکن نہ
ہو (یعنی تم عین الیقین کے اس مرتبہ
تک ابھی پہنچ نہ پائے ہو) تو اس کی عبادت
وبندگی اس طرح کرو گویا کہ اللہ تم کو
ضرور دیکھ رہا ہے[1]

احسان کے دو مرتبے ہیں: ایک ادنیٰ مرتبہ اور دوسرا اعلیٰ مرتبہ اور دین میں احسان کا اعلیٰ مرتبہ مطلوب ہے اور غالباً اسی کا نام توحید شہودی ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے: "مظاہر عالم میں اللہ تعالیٰ کی وحدت و یکتائی، اس کی ربوبیت والوہیت اور اس کی دیگر صفات عالیہ و صفات کمالیہ کا نظارہ"۔ چنانچہ احادیث میں اللہ تعالیٰ کے جو ۹۹ نام بتائے گئے ہیں ان سب کی تطبیق اگر عالم مظاہر میں پائے جانے والے "نظاموں" پر کی جائے تو ان کے کلی مطالعہ سے جو "مجموعی تصویر" سامنے آئے گی وہی "توحید شہودی" ہوگی اور یہ شہود "کشفی و اشراقی" طریقے کے برعکس علمی و استدلالی ہوگا۔ مگر یہ دونوں وجدانی ہوسکتے ہیں[2] اور ان میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ کشف و اشراق کے ذریعہ حاصل ہونے والے وجدان کی تفہیم محض ایک "ذاتی تجربہ" ہونے کی بنا پر ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب کہ اس کے برعکس علمی و استدلالی حیثیت سے حاصل ہونے

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ۱/ ۱۸، مطبوعہ استانبول؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان ۱/ ۳۹، مطبوعہ ریاض

[2] کشف و اشراق پر تفصیلی بحث کے لیے راقم سطور کی کتاب "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" ملاحظہ ہو۔

والے وجدان کی بحث و مباحثہ کے ذریعہ تفہیم کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا دلیل و استدلال کے ذریعہ حاصل ہونے والے شہود کی زیادہ اہمیت ہے، جس کے ذریعہ ہر قسم کے بگڑے ہوئے عقائد و افکار کی اصلاح بھی ممکن ہوسکتی ہے اور یہ اسلام کا اصل طریقہ اور مقصود بالذات ہے، جو اس پورے مطالعۂ فطرت یا مطالعۂ ربوبیت کا حاصل ہے۔ اصل چیز ربوبیت کا اثبات ہے جو مجسم طور پر جلوہ گر ہو کر سامنے آتی ہے۔ گویا کہ یہ پوری کائنات "مجسم ربوبیت" ہے اور اس اعتبار سے قرآن اور سائنس میں مکمل تطبیق ہوسکتی ہے۔

غرض قرآن عظیم اصلاً مطالعۂ ربوبیت یا عالم تکوین کے مشاہدہ کے لیے ایک "گائیڈ بک" کی حیثیت رکھتا ہے۔ کلام الٰہی چونکہ "علم الٰہی" کا پرتو ہے اس لیے وہ عالم تکوین کے مطالعہ و مشاہدہ کے لیے ایک "مشعل" کا سا کام کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کائنات کی بھول بھلیوں میں علم الٰہی کی مشعل لے کر چلے اسے ساری چیزیں اپنے "اصل روپ" میں دکھائی دیتی ہیں اور تمام راستے روشن و منور ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا وہ کہیں بھی بھٹک نہیں سکتا۔ اس لیے موجودات عالم کو ان کے اصل روپ میں (ظاہری اعتبار سے) دیکھنے کے لیے "علم اسماء" کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اسی بنا پر انسان اول کو اس کی تخلیق کے فوراً بعد علم اسماء سے سرفراز کیا گیا تھا تاکہ وہ عالم مظاہر کے نشیب و فراز میں کہیں بھی بھٹکنے نہ پائے۔ چونکہ اس مادی کائنات میں گزر بسر کے لیے اشیاء کو ان کے اصل روپ میں دیکھنا ضروری ہے اس لیے علم اسماء سے واقفیت لازمی و لابدی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر شرک اور مظاہر پرستی کا خطرہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ کیونکہ یہ مظاہر اصلاً ایک جادو کی نگری یا "طلسم ہوشربا" سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔

اس طرح سے مطالعۂ ربوبیت سے جہاں ایک طرف توحید شہودی کا اثبات ہوتا ہے وہاں دوسری طرف شرک اور مظاہر پرستی کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے جو اصل مطلوب ہے اور جس کے لیے انسان کو مظاہر عالم کا تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کے نظاموں کی چھان بین کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے اس پر ابھارا گیا ہے، تاکہ یہ سارے حقائق علمی و استدلالی انداز میں کھل کر سامنے آجائیں اور ان کے ذریعہ موثر انداز میں خدا کی حجت پوری ہو جائے۔ اس اعتبار سے مطالعۂ ربوبیت کے کثیر اغراض و مقاصد ہیں اور وہ متعدد و مختلف جہات میں پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا قرآن اور سائنس کی تطبیق کے موقع پر یہ سارے اغراض و مقاصد پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ورنہ غلط فہمیوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اور سائنس کی تطبیق سے ہر قسم کے غلط اور بے بنیاد افکار و نظریات اور گمراہ کن فلسفوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس وسیع موضوع پر تحقیقی کام کرنا بہت ضروری ہے۔

حاصل یہ کہ جو بندہ مطالعۂ ربوبیت کے باعث توحید شہودی کی منزل تک پہنچ گیا اس نے گویا مرتبۂ "معراج" حاصل کر لیا۔ پس علم اسماء اور مظاہر عالم کا تحقیقی مطالعہ حصول معراج کے لیے سیڑھی کا کام کرتے ہیں اور یہ مرتبہ ہر شخص یا ہر اس سائنسداں کو حاصل ہو سکتا ہے جو کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ نظام کائنات کا مطالعہ کرنے کے بعد باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدت و ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایمان سے مشرف ہو جائے اور اگر وہ بندہ نظام فطرت کے ساتھ ساتھ نظام شریعت کا بھی جامع ہو یعنی ان دونوں سلسلوں سے بخوبی بہرہ ور ہو تو وہ "نور علیٰ نور" کے بمصداق مرتبۂ صدیقین میں داخل ہو جائے گا اور جس بندہ کو یہ مقام بلند مل جائے

وہ انبیائے کرام کا نائب اور سچا جانشین بن کر غافل انسانوں کو متنبہ کرنے والا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انبیائے کرام کے جانشینوں کو اس مقام بلند تک پہونچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسلام، ایمان اور احسان

اوپر مذکور جس حدیث میں "احسان" کا تذکرہ آیا ہے وہ "حدیث جبرئیل" کہلاتی ہے اور اس میں اسلام، ایمان اور احسان کو دین کے تین مراتب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام صحابۂ کرام کی تعلیم کی غرض سے دربار نبوت میں انسانی شکل میں حاضر ہو کر اس طرح سوال کرتے ہیں:

ایمان کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھو۔ پھر سوال کیا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک مت کرو، نماز قائم کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ اسکے بعد پوچھا کہ احسان کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت و بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تمہارے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو استحضار و خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے[1]۔

گویا اسلام احکام دین کی مجرد ادائیگی کا نام ہے، چاہے وہ خوش دلی کے ساتھ ادا کیے جائیں یا بے دلی کے ساتھ۔ ایمان کا مطلب غیبی امور پر اعتقاد رکھنا ہے جو شک کے بالمقابل ہے اور احسان ایمان میں اعلیٰ درجے کی پختگی کا نام ہے اور یہ پختگی اور بصیرت مخلوقات الٰہی میں غور و خوض کے باعث حاصل ہوتی ہے[2]۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں

---

[1] بخاری و مسلم، تفصیلی حوالے اوپر گزر چکے ہیں۔ [2] اور یہ مقصد غالباً "تزکیہ" سے بھی حاصل ہوتا ہے مگر اس پر بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔

مخلوقاتِ الٰہی کے مطالعہ کی پُر زور دعوت دی گئی ہے تاکہ توحید باری کی حقیقت محض "اخباری" اور "استدلالی" نہ رہ جائے بلکہ وہ مشاہداتی بھی بن جائے۔

غرض قرآن اور حدیث میں احسان کا جو لفظ آیا ہے وہ لغوی اعتبار سے حُسنِ سلوک کے علاوہ "حُسنِ عمل" یا اعمال زندگی میں "حُسن کاری" پیدا کرنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ امام راغب تحریر کرتے ہیں: کہ احسان کے ۲ معنی ہیں۔ (۱) کسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنا (۲) کسی کام کو اچھے طریقے سے انجام دینا۔[1]

اور حسب ذیل آیات میں احسان دوسرے معنی پر دلالت کرتا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيناً مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ (نساء: ۱۲۵)

اس سے زیادہ بہتر دین اور کس کا ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا اور حسنِ عمل کا بھی مظاہرہ کیا۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (لقمان: ۲۲)

اور جس نے حُسنِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا۔

اب قرآن اور حدیث میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن میں احسان کے عملی پہلو کا اظہار کیا گیا ہے، جب کہ حدیث میں نظریاتی اعتبار سے اس کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ "ذاتی احسان" کا مفہوم و مصداق کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

[1] المفردات فی غرائب القرآن، ص ۱۱۸۔

بالفاظ دیگر قرآن میں "وَهُوَ مُحْسِنٌ" کا جو بیان آیا ہے اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ "وَمَنْ اَحْسَنُ دِيناً مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ" کے بعد تاکید مزید کے طور پر "وَهُوَ مُحْسِنٌ" کا فقرہ کیوں لایا گیا اس کی حقیقت کیا ہے؟ حدیث شریف میں اس کا جواب دیا گیا کہ اعمال یا فرائض وواجبات کی ادائیگی میں اپنے سامنے اللہ کی موجودگی کا تصور بھی ضروری ہے، ورنہ اعمال میں "حُسن کاری" پیدا نہیں ہو سکتی۔ بہرحال انسان کو صحیح معنی میں انسان بننے اور اپنے کردار و کیرکٹر کو درست رکھنے کے لیے خداوند قدوس کی موجودگی اور اس کے "عیاناً" مشاہدہ کا تصور بہت ضروری ہے ورنہ "ڈھیلے ڈھالے" ایمان کی بدولت حُسنِ عمل کے سوتے پھوٹ نہیں سکتے اور کامل اطاعت و فرمانبرداری کے نمونے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اطاعتِ کاملہ کے لیے "یقین" کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جو عین الیقین اور حق الیقین کے مرتبے میں پہنچ جائے۔

مظاہر فطرت کے اسباق

بہرحال مظاہر فطرت کے مطالعہ سے بنیادی طور پر دو اہم باتیں ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ تمام مظاہر عالم اپنے انتہائی نظم و ضبط کے ذریعہ اپنے خالق و رب کی "اطاعت" میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ تمام مظاہر انسان کے لیے خلاق عالم کی رحمانیت یا اس کی مہربانی کا روپ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ پوری کائنات خدائے واحد کی الوہیت اور اس کی رحمانیت کے ۲ اعلیٰ ترین مظہر ہیں۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ (بقرہ: ۱۶۳)

تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے اسکے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں اور وہ بڑا ہی مہربان اور انتہائی رحم والا ہے۔

چنانچہ آپ زمین سے آسمان تک تمام اشیائے عالم کا جائزہ لیجیے، چاند ستاروں کے

نظاموں کو دیکھئے، دن رات کے ہیر پھیر اور موسموں کے تغیرات پر نظر ڈالیے، خشکی و سمندر کے طبعی احوال و کوائف کا مشاہدہ کیجئے، بارش اور بادلوں کے حیرت انگیز نظاموں کو بغور دیکھئے، زمین پر نباتات اور حیوانات کی رنگا رنگیوں پر نگاہ بصیرت ڈالیے، ہواؤں کے تحیر خیز نظام میں غور کیجئے، عناصر و جواہر کی دقت انگیزیوں کا مشاہدہ کیجئے، غرض جمادات سے لے کر سماوات تک ایک ایک چیز اور ایک ایک مظہر ربوبیت کا تحقیقی مطالعہ کیجئے، تو ہر جگہ اور ہر طرف آپ کو وحدت خدائی اور وحدت الوہیت کے نظارے ملیں گے جو رحمانیت اور مخلوق پروری کے بھیس میں جلوہ گر ہوں گے۔ ہر مقام پر خداوند کریم کی ربوبیت و الوہیت انتہائی مشفقانہ اور انتہائی عادلانہ شکل میں ملے گی اور کہیں بھی آپ کو "دوئی" نظر نہیں آئے گی۔ گویا کہ یہ سب مظاہر کسی بہت بڑی مشین کے کل پرزے ہیں اور سب کے سب منظم و مربوط طور پر اپنے اپنے "فرائض" بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ کوئی ایک ذرہ تک اِدھر سے اُدھر ہو جائے یا اپنے رب کی اطاعت و بندگی سے سرتابی کرنے لگ جائے۔ بلکہ سب کے سب ایک طبعی قانون میں جکڑے ہوئے ہیں۔

وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا۔ (آل عمران: ۸۳)

زمین اور آسمانوں میں جو کوئی ہے خوشی ناخوشی اسی کی اطاعت میں لگا ہوا ہے۔

فطرت و شریعت میں ہم آہنگی

غرض تمام مظاہر فطرت بشمول انسان تکوینی (نیچرل) اعتبار سے "امر الٰہی" کی تعمیل اور اطاعتِ الٰہی میں لگے ہوئے ہیں۔ لہذا خالقِ کائنات کا مطالبہ ہے کہ انسان تشریعی اور اخلاقی اعتبار سے بھی بطور شکر گزاری اطاعت الٰہی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال کر مظاہر کائنات کے سُر میں اپنا سُر ملا لے، تاکہ یہ

پوری کائنات تکوینی اور تشریعی دونوں اعتبار سے متحد اور ان کا نغمہ و ساز ایک ہو جائے اور یہ ایک فطری اور معقول مطالبہ ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ۔ (آل عمران: ۸۳)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرتے ہیں، حالانکہ زمین اور آسمانوں میں جو کوئی ہے خوشی یا ناخوشی اسی کی تابعداری کر رہا ہے اور تمام اسی کی طرف لوٹائے جا رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ انسان سے خلاق عالم کا یہ مطالبہ بالکل علمی و منطقی ہے کہ جس خدائے برتر نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد بطور مہربانی اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تمام مظاہر عالم کو انسان کی خدمت میں لگایا، جن کے فوائد سے وہ قدم قدم پر متمتع اور لطف اندوز ہو رہا ہے، لہذا انسان کے جذبۂ احسان شناسی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کے منشا کے مطابق اپنا رویہ درست کرلے اور پھر اس کی رضامندی حاصل کر کے آنے والی اور ہمیشہ کی زندگی میں سرخروئی کا مستحق بنے ورنہ اس کا انجام برا ہوگا اور وہ ایک دردناک عذاب کا مستحق بنے گا۔

یہی وہ اہم المقاصد ہے جس کی بنا پر انسان کو نظامِ کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ انسان مظاہر فطرت کے نظاموں سے عبرت حاصل کر کے اپنے اعمال کا جائزہ لے اور اپنے خالق و معبود کو پہچان کر اپنے کردار و کیرکٹر کو درست کرلے۔

نظریات و عقائد کا اثر چونکہ اعمال و اخلاق پر پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ

سب سے پہلے انسان کے نظریات و عقائد درست ہوں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں واقعتاً دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو قوم یا جو لوگ خدا پرست ہوں اور ایک جزا و سزا کے دن کا اعتقاد رکھتے ہوں تو وہ معاملات زندگی میں کسی دوسرے پر ظلم و زیادتی نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے حقوق غصب نہیں کریں گے بلکہ ہر ایک کے ساتھ انصاف اور حسنِ اخلاق کا برتاؤ کریں گے ۔ نتیجہ یہ کہ جس معاشرہ کے لوگ خدا پرست اور با کردار ہوں اس معاشرہ میں پوری طرح امن و امان قائم رہے گا اور وہ ایک مثالی معاشرہ کہلائے گا ۔ اس کے برعکس جس قوم کا خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو وہ اس دو روزہ زندگی ہی کو سب کچھ تصور کرتے ہوئے ایک دوسرے کو لوٹنے اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرے گی اور ایسے معاشرہ میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں گے ، فسادات برپا ہوں گے اور ایک دوسرے کے حقوق غصب کیے جائیں گے ۔

کتابِ ہدایت کا کمال

حاصل یہ کہ خوفِ خدا اور خوفِ آخرت ہر قسم کی اخلاقی ، معاشرتی ، تمدنی ، اجتماعی ، سیاسی اور بین الاقوامی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے اور آج روئے زمین پر اس تحریک کا داعی و علمبردار صرف اسلام ہے ، جو خالص علمی و عقلی اور سائنٹفک انداز میں دعوتِ فکر دے کر انسان اور کائنات کے درمیان ایک منطقی رابطہ قائم کرتا ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا معقول اور تشفی بخش انداز میں جواب دے کر اس کے لیے "سامانِ ہدایت" فراہم کرتا ہے اور اس اعتبار سے یہ کتابِ حکمت صرف تشریعی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ تکوینی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی انسان کے لیے کتابِ ہدایت"

ہے ۔ تاکہ انسان مظاہرِ فطرت کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے اور گمراہ ہونے نہ پائے ۔

مگر اس کلامِ برحق کی ایک خاص زبان اور خاص اسلوب ہے جو انسانی زبانوں اور انسانی اسالیب سے میل نہیں کھاتا ۔ جیسا کہ خود ایک حدیث میں اس کی اس اعجازی صفت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے :

وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ : اور انسانی زبانیں (اس کے اسلوب اور طرز ادا سے) میل نہیں کھاتے [1]

الغرض اس کتابِ حکمت کے جلوے اور اس کی معجز نمائیاں ہر دور میں ظاہر ہوتی رہیں گی اور اس کے اسرار و معارف کا اختتام کبھی نہ ہو سکے گا ۔ نئے نئے اکتشافات کے باعث اس کے رموز و حقائق ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے ، جن کے ملاحظہ سے صحیفۂ ربانی کی عظمت و صداقت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے ، جیسا کہ ارشاد باری ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔
(حٰم سجدہ : ۵۳)

ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے ان کے چاروں طرف اور خود ان کے اپنے انفس (جسمانی نظاموں) میں بھی ، تا آنکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ کلامِ برحق ہے ۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۔
(ص : ۸۷-۸۸)

یہ تو سارے جہان کے لیے ایک تذکرہ (یاد دہانی کرانے والی چیز) ہے اور تم اس کی (سچائی کی) خبر کچھ عرصے بعد ضرور جان لوگے ۔

---

[1] ترمذی کتاب فضائل القرآن ۵/۱۷۲ ، مطبوعہ بیروت دارمی ۲/۳۵ھ بیروت ۔

قرآنی اخبار کی قدر و قیمت

قرآن حکیم کے مذکورہ بالا دونوں مقامات میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کلام حکمت میں بہت سے حقایق "نبا" یعنی خبر کے طور پر مذکور ہیں، جن کی صداقت مستقبل میں ظاہر ہونے والی ہوگی۔ ان حقایق کو ہم "قرآنی اخبار" کہہ سکتے ہیں، جن کی صداقت "آفاقی" اور "انفسی" دلائل یعنی مستقبل کے علمی اکتشافات کے ذریعہ ظاہر ہوگی اور اس تطبیق سے کلام الٰہی کا علمی اعجاز ظاہر ہوگا اور اس کی حقانیت واضح ہوجائے گی مگر قرآنی اخبار اور کائناتی حقایق (تکوینیات) کی تطبیق کے لیے دو بنیادی شرطیں ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ قرآنی الفاظ اور اس کے مدلولات میں بیجا طور پر تاویل نہ کی جائے۔ بلکہ قرآنی الفاظ و آیات سے منصوص طور پر استدلال کیا جائے اور دوسری شرط یہ ہے کہ کلام الٰہی علم الٰہی کا مظہر ہونے کی وجہ سے اصل ہے، لہٰذا تعارض کے موقع پر اس میں تاویل نہ کی جائے، جیسا کہ اس سلسلے میں قدیم فلاسفہ اور متجددین کی روش رہی ہے۔ غرض قرآن اور جدید حقایق میں اگر تعارض ہو تو ایسے موقع پر کلام الٰہی میں تاویل کرنے کے بجائے کہا جاسکتا ہے کہ علم انسانی ابھی حقیقت حال تک نہیں پہنچا۔ لہٰذا مزید تحقیقات کا انتظار کیا جائے۔

بہر حال قرآنی اخبار اور کائناتی حقایق کی تطبیق سے حسب ذیل حقایق و معارف سامنے آتے ہیں۔

۱۔ قرآن اور کائنات کی تطبیق سے سب سے پہلی حقیقت جو سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ علم جدید اپنی تحقیقات کے ذریعہ علم الٰہی کی تصدیق و تائید کر رہا ہے اور قرن ہا قرن پہلے کیے گئے قرآنی دعووں پر مہر تصدیق ثبت کر رہا ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ بے شمار نتائج کا حامل ہے۔

۲۔ علم انسانی اپنی تحقیقات کے ذریعہ جب علم الٰہی کی تصدیق کر دے تو قرآن کا "نظریۂ علم" محکم ہوجاتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی "اخبار" کی بہت بڑی قدر و قیمت ہے۔ یعنی قرآن کے اخبار یا اس کے بیانات پتھر کی لکیر کی طرح اٹل اور صدق و سچائی سے پُر ہوتے ہیں، جن کی صداقت ہر دور میں ظاہر ہوتی رہے گی اور اس کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکے گا (لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ)

۳۔ قرآن اور کائناتی حقایق کی تطبیق سے بڑی حقیقت جو ثابت ہوگی وہ یہ ہے کہ اس سے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں ربط و تعلق پیدا ہوجائے گا اور وہ سارے حقایق نیز عقائد صحیح اور برحق ثابت ہوجائیں گے، جن کو مذہب ثابت کرنا اور منوانا چاہتا ہے اور یہ بات فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بہت ہی اہم ہے۔

۴۔ اس تطبیق سے جہاں ایک طرف روح اور مادہ میں مطابقت ثابت ہوگی وہیں دوسری طرف علم انسانی بھی قابل استدلال ہوجائے گا۔ یعنی یہ نظریہ محکم ہوجائے گا کہ علم انسانی بھی حقیقت حال تک پہنچ سکتا ہے۔

۵۔ اس تطبیق سے الحاد و دہریت اور الحادی فلسفوں کا رد و ابطال بھی بخوبی ہوجائے گا اور ثابت ہوگا کہ اس کائنات کا ظہور ایک منصوبہ بند طریقے سے ہوا ہے نہ کہ بخت و اتفاق کے تحت۔

۶۔ اس تطبیق سے صاف ظاہر ہوجائے گا کہ علم صرف وہی نہیں ہے جو حواس، عقل اور تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ علم وہ بھی ہے جو وحی الہام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جس سے مادہ پرست فلسفیوں کو انکار ہے۔

۷۔ اس مظاہرۂ حق کا ایک روشن ترین پہلو یہ ہوگا کہ اس سے علم الٰہی کی

"ازلیت" کا آفاقی نظارہ ہو جائے گا اور ثابت ہو گا کہ اس کائنات میں ایک "علیم و خبیر" ہستی ضرور موجود ہے جو پس پردہ رہ کر اپنے جلوے دکھا رہی ہے ورنہ قرآن اور کائنات میں اتنی زبردست مطابقت ہرگز نہ پائی جاتی۔

۸۔ قرآن اور کائنات کی تطبیق سے علم الٰہی اور قدرت الٰہی کا خصوصی طور پر اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفت علم اور کائنات (تکوین) اس کی صفت قدرت کے دو مظاہر ہیں اور ان دونوں کی مطابقت سے حقائق کا ظہور اور معرفت الٰہی کا حصول ہوتا ہے اور شکوک و شبہات کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں۔

۹۔ قرآن اور کائنات کی تطبیق سے ربوبیت کی حقیقت واضح ہوتی ہے اس کے نتیجے میں توحید شہودی کی جلوہ نمائی ہوتی ہے، جس کے باعث ہر قسم کی بدعقیدگیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ اس مظاہرۂ حق سے منکرین پر موثر انداز میں حجت ثابت ہو جائے گی، جو نوعِ انسانی کے لیے ہدایت و رہنمائی کا باعث ہے، یعنی قرآنی دلائل و براہین کے ملاحظہ کے بعد جس کسی کو راہِ ہدایت اختیار کرنا ہو وہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے اختیار کرے اور جسے مرنا ہو وہ دلیل و حجت دیکھ کر مر جائے۔

حاصل یہ کہ قرآنِ عظیم کی نظر میں علم انسانی حجت ہے اور وہ حقیقتِ حال تک پہنچ سکتا ہے اور اس پر بے شمار قرآنی آیات دلالت کرتی ہیں ورنہ اگر اس علم کو قابل حجت نہ مانا جائے تو پھر یہ حقایق ثابت نہیں ہو سکتے اور قرآنِ عظیم کا علمی اعجاز بھی ظاہر نہیں ہو سکتا، جو عصر حاضر کے لیے ایک معجزہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب حکمت اپنے دلائل و براہین کے لحاظ سے بھی ایک زبردست معجزہ ہے۔

ابونواس

از جناب بہار الحق رضوی صاحب۔ رامپور

ولادت اور وفات

ابونواس بن ہانی بن عبدالاول معروف بہ ابوعلی و ابونواس دورِ عباسیہ کا ایک مشہور اور معروف شاعر ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ عبداللہ بن معتز[1] کے قول کے مطابق ابونواس ۱۳۹ھ میں بمقام اہواز پیدا ہوا اور بغداد میں ۱۹۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس وقت اس کی عمر پچپن سال تھی۔ ابن خلکان نے ان کا سنِ پیدائش ۱۳۶ھ یا ۱۴۵ھ نقل کیا ہے اور تاریخ وفات ۱۹۵ھ یا ۱۹۸ھ تحریر کی ہے[2]۔ ابن عساکر کے قول کے مطابق حسن بن ہانی ۱۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا[3]۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بموجب ابونواس ۱۳۰ھ اور ۱۴۵ھ (۷۴۷ء اور ۷۶۲ء) کے درمیان پیدا ہوا اور ۱۹۸ھ اور ۲۰۰ھ (۸۱۳ء اور ۸۱۵ء) کے درمیان وفات پائی۔ ۱۹۵ھ میں اس کی وفات کو اس لیے غلط ٹھہرایا ہے کہ اس نے خلیفہ الامین[4] کے انتقال پر اس کا مرثیہ لکھا ہے جو اس کے دیوان میں موجود ہے۔ الامین کا انتقال ۱۹۸ھ میں ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام[5] نے اس کی موت کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ الامین نے شراب پینے کی وجہ سے اسے قید کر دیا تھا اور اس کی موت قید خانے میں ہوئی جو ضعیف ہے، دوسری روایت کے مطابق اس کی موت ایک Tavern- keeper

کے گھر ہوئی۔ تیسری روایت میں اس کی موت نوبخت کے شیعہ خاندان میں ہونا بتائی ہے جس کی وجہ اسمٰعیل بن سہل سے خصوصی تعلقات ہونا بتائی ہے، لیکن یہ بہتان معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی خاندان نے ابونواس کے کلام کو جمع کرانے میں خاص مدد کی اور حمزہ اصفہانی نے اسی خاندان سے معلومات حاصل کیں۔

حسب ونسب | ابونواس حکمی تھے اور اس کا تعلق قبیلۂ حکم بن سعد العشیرہ (یمن کا ایک قبیلہ) سے تھا۔ اس کے دادا جراح بن عبداللہ گورنر خراسان کے غلام تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے والد مروان بن محمد کی فوج میں سپاہی تھے جن کا نام ہانی تھا، ابونواس نے اپنے باپ کا نام تبدیل کر دیا اور اپنے آپ کو حسن بن ہانی کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ مسعود ماذرانی کی وزارتِ مال میں محرر تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بکریوں کا چرواہا تھا یا کپڑے بُننے کا کام کرتا تھا۔[۶]

ابونواس کی ماں کا نام جُلبان تھا۔ وہ اہواز کی رہنے والی تھی جو اون اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ ہانی نے اس کو کپڑے دھوتے دیکھا تھا اور اس کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا نام شحمہ بنت تسرمن تھا اور وہ اہواز کے ایک گاؤں باب آزار کی رہنے والی تھی[۷]۔

ابونواس کے مقامِ پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اس کے گاؤں کا نام باب شیر وکان تھا۔ جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ وہ مناظر صغریٰ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ اہوازی تھا۔[۸]

کنیت | ابونواس کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ خود اس نے یہ بتائی ہے کہ نواس، جدان، یازان، کلال اور کلاع حمیر کی پہاڑیوں کے نام ہیں اور ان میں سے

پہلے کے نام سے ان کی نسبت ہے[۹]، دوسری وجہ اس نے یہ بیان کی ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب زلفیں تھیں اور ان کی وجہ سے اس کے پڑوسی نے اس کو ابونواس کہدیا تھا اس وجہ سے وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

نسل وقبیلہ | ابونواس کی نسل کے بارے میں کوئی بات تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غلام خاندان سے واسطہ رکھتا تھا اور بعض اوقات اپنے آپ کو عبیداللہ بن زیاد (قبیلۂ عامر بن تائم اللات) کا بیٹا کہتا تھا۔[۱۰] لوگوں نے اس سے کہا کہ تم خود کو اس شخص کا بیٹا کہتے ہو جس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اگر تم اپنے آپ کو ابان کا بیٹا کہتے جو عبیداللہ کا بھائی تھا تو ہم مان لیتے۔ ابان خارجی تھا اور اس کو مصعب بن زبیر نے قتل کر دیا تھا۔ اس واقعہ پہ ابونواس قبیلہ بنو عامر کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ دوسرے موقع پر اس نے خود کو فرزدق (دور امیہ کا شاعر) کی اولاد سے قرار دیا[۱۱] اور اپنے آپ کو قبیلہ بنو نظیر کا فرد کہا۔ لیکن در اصل وہ ایرانی النسل تھا اور اس کا دادا قبیلہ حکم بن سعد العشیرہ کا مولیٰ تھا۔ 'اخبار ابی نواس' کے مصنف نے حکم بن سعد العشیرہ کا نام اس کے بزرگوں میں شامل کر لیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے اجداد کا نام در اصل کسی کو معلوم نہیں۔ اگر وہ کسی مشہور قبیلہ کا فرد ہوتا تو وہ اپنا تعلق کبھی ایک قبیلے سے اور کبھی دوسرے سے نہ جوڑتا۔ ہجو کے خوف سے وہ اپنے صحیح حسب ونسب کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہے۔ لاحقہ کے اشعار سے صحیح صورتِ حال واضح ہوتی ہے۔

ابونواس بن ہانی — وامہ جلبانی
والناس افطن شیء — الیٰ دقیق المعانی
ان زدت حرفاً علیٰ ذ — باصاح فاقطع لسانی

یہ بھی خیال ہے کہ اس کی ماں کوئی اچھی عورت نہ تھی۔ ان تمام امور کے پیش نظر وہ کہتا ہے کہ میرے خاندان کے بجائے میرے کمالات پر نظر رکھو۔

ابتدائی زندگی | ابونواس ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ چند سال اہواز میں رہا اس کے بعد بصرہ چلا گیا۔ اس نے قرآن شریف کی تعلیم یعقوب الحضرمی سے حاصل کی۔ جب اس نے تعلیم ختم کی تو استاذ نے کہا۔ "جاؤ! اب تم بصرہ کے سب سے بڑے قاری ہو"۔

والبہ سے ملاقات | جب ابونواس لڑکا ہی تھا تو اس کی ماں نے اسے بصرہ کے عطاروں کے سپرد کر دیا۔ ابونواس ان کی دوکان پر رات دن محنت کرتا تھا لیکن اس کو یہ کام پسند نہیں تھا۔ اس کا ذوق و شوق ادب اور شاعری کی طرف تھا۔ انہیں دنوں اس کی[۱۰] ملاقات والبہ بن حباب الاسدی سے ہوگئی جن کا اثر ابونواس پر ساری عمر باقی رہا۔ والبہ سے ملاقات کے بارے میں بہت سی حکایات بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ والبہ ایک بار کسی کام سے بصرہ آیا اور وہاں اس ذہین لڑکے سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ وہ ابونواس کی ذہانت سے بہت متاثر ہوا۔[۱۱] ابونواس بھی والبہ (ابو اسامہ) کی شاعری سے بہت متاثر ہوا۔ والبہ ابونواس کو بصرہ سے کوفہ لے گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ والبہ ابونواس کی ذہانت کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و جمال سے بھی متاثر ہوا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نجاشی الاسدی نے عطاروں کی ایک جماعت کو بصرہ سے اہواز بلایا تھا۔ اس جماعت کے ساتھ ابونواس بھی تھا۔[۱۲] نجاشی الاسدی کا بھائی والبہ تھا اور وہاں اس نے ابونواس کو دیکھا تھا اور اس کی ذہانت سے بہت متاثر ہوا۔ والبہ نے یہ محسوس کیا تھا کہ ابونواس میں اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ والبہ نے بطور

شاعر اور نقاد کے ابونواس کو متاثر کیا۔

عرب کا دورہ | اس کے بعد ابونواس عرب گیا اور وہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں اور عرب کے بارے میں عام معلومات حاصل کیں۔ عرب کی جنگوں اور صلح کے ایام اور عربوں کے طور طریقوں کا اسے علم ہوا۔

ابونواس ابو عبیدہ کے حضور میں | ابونواس نے عربوں کی شاعری، ان کی روایات اور جنگ و صلح کے بارے میں معلومات کا خزانہ ابو عبیدہ (۱۱۰ھ تا ۲۱۱ھ) سے حاصل کیا جو عربی زبان و ادب کے مشہور علامہ[۱۳] تھے۔

خلاف سے ملاقات | والبہ کے انتقال کے بعد ابونواس خلاف الاحمر بصری کے روبرو بحیثیت شاگرد حاضر ہوا۔ وہ قبیلہ بلال بن ابی بردہ کے غلام تھے۔ ان کی شہرت اور علمی عظمت کا یہ معیار تھا کہ اخفش نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ "میں نے خلاف اور اصمعی سے زیادہ قابل کسی شخص کو نہیں دیکھا"۔ ابونواس نے شعرائے عرب کے کلام اور عروض کی تعلیم خلاف سے حاصل کی۔ ابونواس خلاف سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے مرثیہ میں ابونواس نے یہ شعر بھی کہا ہے

اودی جماع العلم مذ اودع الخلف

ابونواس نے غریب الفاظ اور محاورات کا علم ابو زیاد سے حاصل[۱۴] کیا اور روایات عرب کے بارے میں عبدالواحد بن زیاد، یحییٰ بن قدان اور الجھ سال کے ذریعہ آشنا ہوا۔[۱۵] علوم کی تحصیل کے بعد ابونواس نے بغداد کو کوچ کیا اور بقیہ عمر وہاں گزاری۔

ابونواس دربار میں | یہ امر معلوم نہیں کہ ابونواس دربار میں کس وقت حاضر

ہوئے لیکن اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ابوجعفر منصور کے زمانے تک ابونواس کی رسائی دربار میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ غالباً المہدی یا الہادی کے زمانے تک دربار تک پہونچے لیکن ان کو صحیح مقام ہارون الرشید اور امین الرشید میں حاصل ہوا۔ دونوں ابونواس کی بڑی عزت کرتے تھے اور محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ دربار میں اکثر موجود رہتے اور خلیفہ کو ہنساتے رہتے تھے۔ اس لیے اکثر لوگوں نے ان کو صرف درباری ظریف کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بقول نکلسن:

"ابونواس کو یوروپین نے محض ایک درباری کی حیثیت سے جانا ہے اور ان کے لطیفے الف لیلہ کی کہانیوں کے ذریعہ سے سُنے ہیں اور ان کو صرف وہ ہارون الرشد کے درباری کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کو مشرق کا ہاڈ گلاس (Hawde Glass) یا جوملر (Joemiller) سمجھتے ہیں[۱۵]"

ایک مرتبہ زبیدہ خاتون نے الامین سے کہا کہ وہ اپنے اشعار ابونواس کو دکھایا کریں۔ الامین نے اپنے اشعار ابونواس کو دکھائے۔ ابونواس نے اس کی غلطیوں کی طرف نشاندہی کی اس پر الامین ناراض ہوئے اور ابونواس کو قید کر دیا۔ ہارون نے اسے رہا کر دیا اور اپنے بیٹے کو سخت سُست کہا۔ کسی دوسرے موقع پر ہارون نے الامین سے کہا کہ وہ اپنے اشعار ابونواس کو سُنائے۔ الامین نے اپنے اشعار ابونواس کو سُنائے اس پر ابونواس اُٹھے اور باہر جانے لگے۔ ہارون نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" ابونواس نے کہا۔ "جیل جا رہا ہوں"!!

ابونواس کے کثیر اشعار خمر کی تعریف میں ہیں۔ خمریات کا حصہ اس کی شاعری کا

معتدبہ حصہ ہے۔ اس کے خمریات کے اشعار کا عربی ادب عالیہ میں شمار ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ومتطیل علی الصهباء باکرها — فی فتیة باصطباح الراح حزاق

فکل شیئ رآه ظنه قدحا — وکل شیئ رآه قال ذا ساق

(ترجمہ: صبح کے وقت جب کوئی شخص اُٹھتا ہے تو صبح کی شراب کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ بہترین شراب پینے والوں کی مجلس یہاں تک کہ وہ جو چیز دیکھتا ہے اس کو شراب کا بھرا ہوا پیالہ تصور کرتا ہے اور جس شخص کو دیکھتا ہے اسے ساقی سمجھتا ہے)

وہ خمر کے استعمال کے سلسلہ میں ان لوگوں سے اختلاف رکھتا ہے جو چھپ کر پینا پسند کرتے ہیں۔ وہ علی الاعلان میخواری کے حق میں تھا۔ علانیہ میخواری کے حق میں اس کے بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فاسقنی سراً و قل لی هی الخمر — ولا تسقنی سراً اذا امکن الجهر

(مجھے شراب پلاؤ اور کہدو کہ یہ شراب ہے اور مجھے چھپا کر نہ پلاؤ جب کہ علانیہ پلانا ممکن ہو)

وندمان یری غبناً علیه — بان یدعی ولیس به انتشاء

اذا نادیته من نوم سکر — کفاه مرة منک النداء

فلیس بقائلٍ لک ایه دعنی — ولا مستخبرٍ لک ما تشاء

ولکن اسقنی ویقول ایضاً — علیک الصرف ان اعیاک ماء

اذا ما ادرکته الظهر صلی — فلا عصر علیه ولا عشاء[۱۸]

(کچھ دوست احباب اس کو نقصان قرار دیتے ہیں جب ان سے اٹھنے کو کہا جاتا ہے

اور وہ نشہ میں نہیں ہوتے۔

جب تم ان کو آواز دیتے ہو نشہ کی نیند سے تو ان کے لیے ایک مرتبہ کی آواز کافی ہوتی ہے۔

وہ یہ نہیں کہتا کہ تم مجھے چھوڑ دو اور نہ تمہیں اکیلا چھوڑتا ہے کہ جو چاہو کرو۔

لیکن وہ کہتا ہے کہ مجھے شراب پلاؤ اور تم سے کہتا ہے کہ تم بھی پیو۔ اگر تم پانی ملی ہوئی سے تھک گئے ہو تو خالص پیو۔

اگر تجھے ظہر کا وقت مل جائے تو پڑھ لے پھر عصر سے عشا تک کا کھو دے۔)

ایک مرتبہ الامین نے ابونواس کو قید کر دیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ کثرت سے شراب پیتا ہے اور بیہودہ اشعار بھی کہتا ہے۔ الامین نے اسے طلب کیا تاکہ اسے قتل کرا دے تو اس نے مندرجۂ ذیل اشعار برجستہ کہے:

تذکر امین اللہ والعھد یذکر — مقامی وانشادیک والناس حضر

ونثری علیک الدر یادرُّ ھاشم — فیا من رایٰ درًّ علی الدُّرِّ ینثر

ابوک الذی لم یملک الارض مثلہ — وعمک موسیٰ الصفوۃ المتخیر

وجدک مھدی الھدیٰ وشقیقہ — ابوامک الادنیٰ ابوالفضل جعفر

ایا خیر مامونٍ یرجیٰ انا امرأٌ — اسیرٌ رھینٌ فی سجونک معتبر

مضت لی شھورٌ مذ حُبست ثلاثۃ — کانی قد اذنبت مالیس یغفر

فان کنت لم اذنب ففیم حبستنی — وان کنت ذا ذنب فعفوک اکبر[۱۹]

(ترجمہ: اے اللہ کے امین! یاد کرو وہ زمانہ جب کہ میں شعر پڑھتا تھا آپ کے اور آپ کے حاضرین کے سامنے اور شاعر کو یاد کیا ہی جاتا ہے۔

اے خاندانِ ہاشم کے موتی! میں تیرے اوپر موتی نچھاور کرتا ہوں۔ ہے کوئی دیکھنے والا کہ موتی پر موتی نچھاور کیے جا رہے ہیں۔

تیرا باپ ایسا تھا کہ زمین اس جیسے کسی اور کی مالک نہیں ہوئی (یعنی زمین پر تیرے باپ جیسا کوئی دوسرا نہیں تھا) اور تیرے چچا موسیٰ تھے جو برگزیدہ تھے اور متخیر تھے۔

تمہارے دادا مہدی تھے اور ان کے چچازاد بھائی تمہارے قریب ترین ماموں ابوالفضل جعفر تھے۔

اے وہ شخص جس کی مہربانی کی توقع کی جاتی ہے۔ میں تمہاری قید میں ایسا ہوں جیسے کوئی قبر میں ہو۔

میں تین مہینے سے قید میں ہوں، کیا میں نے ایسا کوئی جرم کیا ہے جو قابل معافی نہیں ہے۔

میں نے اگر کوئی جرم نہیں کیا ہے تو آپ نے مجھے قید میں کیوں رکھا ہے اور اگر میں نے جرم کیا ہے تو آپ کی معافی میرے جرم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔)

کیا ابونواس ملحد تھا۔ ابونواس پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ ملحد تھا اور زنادقہ سے متاثر تھا۔ اس سلسلہ میں اس کے اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ الامین نے اسے طلب کیا اور دریافت کیا کہ یہ شعر تم نے کہا ہے۔

یا احمد المرتجیٰ فی کل نائبۃ — قم سیدی نعص جبار السموٰت

(ترجمہ) اے احمد! جن سے ہر طرح کی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمارے سردار اٹھ کھڑے ہو جائیے تاکہ ہم آسمان کی جبار طاقت کی نافرمانی کریں۔)

ابونواس نے اثبات میں جواب دیا۔ علمائے وقت سے رائے مانگی گئی انہوں نے ایسے شخص کو واجب القتل قرار دیا۔ ابونواس نے کہا کہ یا تو ان علماء کی ذہنی کمزوری ہے یا

علم کی کمی ہے کہ انہوں نے نہیں سمجھا کہ میں جبار السمٰوٰت کا اقرار کر رہا ہوں اور مجھے منکر قرار دیتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ سنجیدہ شاعری اور ظریفانہ کلام میں فرق محسوس نہیں کرتے۔

ابونواس نے کہا میں نے تو یہ شعر بھی کہا ہے۔

قد کنت خفتک ثم آمننی　　من ان اخافک خافک اللہ[۲۱]

(ترجمہ: میں پہلے آپ سے ڈرتا تھا۔ پھر مجھے اس خیال نے اطمینان دلایا کہ آپ خود اللہ سے ڈرتے ہیں)

ابونواس ملحد نہیں تھا۔ وہ خدا کی وحدانیت اور اس کے ارحم الراحمین ہونے کا قائل تھا۔ اس نے اپنے اکثر اشعار میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ خدا بخشنے والا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں لیکن اس کی رحمت اور بخشش میرے گناہوں سے بہت زائد ہے۔ اس کے یہ اشعار اس عقیدہ کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ملحد نہیں تھا۔

ایا من لیس لی منہ مجیرٌ　　بعفوک من عذابک استجیر

انا العبد المقر بکل ذنبٍ　　وانت السید المولیٰ الغفور

فان عذبتنی فبسوء فعلی　　وان تغفر فانت بہ جدیر

افر الیک منک واین الا　　یفر الیک منک المستجیر[۲۲]

(ترجمہ: اے وہ ذات! کہ جس سے میرے پاس کوئی بچاؤ کا راستہ نہیں ہے۔ میرے تیرے عفو کی صفت کی ہی وجہ سے تیری پناہ ڈھونڈھتا ہوں۔

میں ایک ایسا بندہ ہوں کہ جو اپنے سب گناہوں کا اقرار کرتا ہوں اور تو آقا ہے جو معاف کرنے والا ہے۔

اگر تو مجھے عذاب دیتا ہے تو میرے برے افعال کی وجہ سے اور اگر معاف کرتا ہے

تو اس لیے کہ تو معاف کرنے والا ہے۔

میں تجھ سے ہی فرار ہوکر (اپنے گناہوں کی وجہ سے) تیری طرف فرار اختیار کرتا ہوں اور تیرے علاوہ تجھ سے فرار اختیار کرنے والے کے لیے پناہ کی دوسری جگہ ہے بھی کون سی؟)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتقال سے قبل ابونواس نے دو انگشتریاں تیار کرائیں۔ ایک پر یہ الفاظ کندہ کرائے تھے۔

یشھد ابن ھانی ان اللہ احد　　(ترجمہ ابن ہانی گواہی دیتا ہے کہ خدا ایک ہے)۔

اور دوسری پر۔

تعاظمنی ذنبی فلما قرنتہ　　بعفوک ربی کان عفوک اعظما[۲۳]

(ترجمہ: میرے گناہوں کی زیادتی مجھے گھیرے ہوئے ہے لیکن جب میں اس کا مقابلہ تیرے عفو سے کرتا ہوں تو تیرا عفو بہت زیادہ ہے)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار ابونواس نے اپنے کفن میں رکھے جانے کے لیے کہے تھے۔

ایا رب قد احسنت عوداً وبداءۃً　　الیّ فلم ینھض باحسانک الشکر

فمن کان ذا عذر لدیک وحجۃ　　فعذری اقراری بان لیس لی عذر[۲۴]

(ترجمہ: تونے مجھ پر شروع میں بھی احسانات کیے اور آخر میں بھی لیکن میرا شکر تیرے احسانات کے برابر نہ ہو سکا۔ دوسرے لوگ اپنا عذر پیش کر سکیں گے اور دلائل بھی رکھتے ہوں گے لیکن میرا عذر صرف اپنے گناہوں کا اقرار ہوگا)

ابونواس پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ وہ ثنوی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس نے یہ اشعار کہے۔

ومستعبد اخوانہ بثرائہ　　لبست لہ کبراً ابر علی کبر

اذا ضمنی یوماً و ایاہ محفل   رأی وعرا یزید علی الوعر
اخالفہ فی شکلہ، وأجرہ   علی المنطق المنزور والنظر الشزر
لقد زادنی تیھاً علی الناس انی   أرانی أغناھم وان کنت ذا فقر
فواللہ لا یبدی لسانی بحاجۃ   الی احد حتی اغیب فی القبر
فلا تطمعی فی ذالک منی سوقۃ   ولا ملک الدنیا المحجب فی القصر[25]

(ترجمہ: بہت سے لوگ جو اپنی دولت کے اثر سے اپنے بھائیوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، ان کا فخر میرے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہوتا ہے (یعنی میں بغیر دولت کے اپنے بھائیوں کو متاثر کرتا ہوں۔

جب وہ اور ہم کسی محفل میں ملتے ہیں تو وہ میرے مزاج کی سختی کو دیکھتا ہے کہ میرے مزاج کی سختی زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

میں اس کی ہر شکل میں مخالفت کرتا ہوں اور اس کو ایسی بات چیت میں کھینچ لاتا ہوں کہ وہ پشیمان نظر آتا ہے۔

میرا غرور لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑھ جاتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میں زیادہ غنی ہوں حالانکہ میں فقر اور غریبی والا ہوں۔

خدا کی قسم میری زبان کسی کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے نہیں کھلے گی یہانتک کہ میں قبر میں چھپ جاؤں گا۔

پس کوئی شخص مجھ سے کوئی طمع نہ کرے جو کسی چیز کی خواہ وہ کوئی بازار والا ہو یا دنیا کا کوئی بادشاہ ہو جو پردے پڑے ہوئے محلوں میں رہتا ہو)

اس پر الامین اس سے ناراض ہوا۔ اس وقت سلمان ابن جعفر بھی موجود تھا۔

جس کی ابونواس نے کسی موقع پر ہجو کی تھی اس نے الامین سے کہا کہ ابونواس ثنوی ہے اور کچھ افراد کو شہادت میں پیش کیا جنھوں نے کہا کہ ایک روز یہ شراب پی رہا تھا اور اس نے اپنا پیالہ بارش میں رکھ دیا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا تم لوگ کہتے ہو کہ بارش کے قطروں کے ساتھ فرشتے زمین پر آتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ کچھ فرشتوں کو نگل لوں اس پر الامین نے ابونواس کو قید میں ڈال دیا۔ ابونواس نے قید میں یہ اشعار کہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ وہ ثنوی تھا اور نہ ملحد۔

یارب ان القوم قد ظلمونی   وبلا اقتراف معطل حبسونی
والی الجحود بما عرفت خلافہ   ربی الیک بکذب بھم نسبونی
ما کان الا الجری فی میدانہم   فی کل خزی والمجانۃ دینی
لا العذر یقبل لی ولیفرق شاھدی   منھم ولا یرضون حلف یمینی
ما کان لو یدرون اول مخبأ   فی دار منقصۃ ومنزل ھون
اما الامین فلست ارجو دفعہ   عنی فمن لی الیوم بالمامون[26]

(ترجمہ: اے رب میری قوم نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور بلا کسی جرم کے مجھے قید میں ڈال دیا ہے۔ اے میرے خدا! الجھنوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے اور اس بات کا الزام لگایا ہے جس کے خلاف میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں نے ان کے میدان میں قدم رکھا ہے اور میں وہی کرتا ہوں جو یہ کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ مزاح میں نے اختیار کیا ہے۔ نہ تو میرا عذر سنا جاتا ہے اور نہ میرے گواہ آتے ہیں اور نہ میری قسم پر یقین کیا جاتا ہے۔ میرا گناہ یہ ہے کہ میں مزاح کرتا ہوں اس جگہ پر جس میں برائیاں ہیں اور رکیک ہے۔ کاش وہ یہ سمجھ جاتے۔ جہانتک الامین کا تعلق ہے میں اس سے بچ کر

جانے کی امید نہیں کرتا اور ہے بھی کون جو مجھے مامون کے پاس تک لے جائے۔

ذہانت | ایک مرتبہ ابونواس ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہوا تو اس وقت وہ خالصہ نامی باندی سے محوِ گفتگو تھا۔ جس کا رنگ کالا تھا۔ وہ بادشاہ کا عطا کیا ہوا ہار پہنے تھی۔ بادشاہ نے ابونواس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، ابونواس نے اپنے اشعار بھی سنائے لیکن بادشاہ متوجہ نہیں ہوا۔ واپس آتے ہوئے ابونواس نے یہ شعر دروازہ پر لکھ دیا۔

لقد ضاع شعری علیٰ بابکم　　　کما ضاع عقد علی خالصہ

(ترجمہ: میرے اشعار آپ کے سامنے اس طرح ضایع ہوجاتے ہیں جس طرح خالصہ کے گلے میں ہار ضایع ہوتا ہے)

جب خلیفہ کو معلوم ہوا تو وہ ناراض ہوا اور ابونواس کو طلب کیا۔ ابونواس نے حاضری کے وقت دونوں مصرعوں کی 'ع' کو مٹا کر 'ء' بنا دیا اور بادشاہ کی ناراضگی پر جواب دیا کہ میں نے تو یہ شعر کہا ہے۔

لقد ضاء شعری علیٰ بابکم　　　کما ضاء عقد علیٰ خالصہ

(ترجمہ: میرے شعروں کی رونق آپ کے سامنے ایسی بڑھ جاتی ہے جس طرح خالصہ کے گلے میں ہار کی)

اس چھوٹے سے واقعہ سے ابونواس کی ذہانت اور فطانت کا پتہ چلتا ہے۔

بے راہ روی | ابونواس دورِ عباسی کا ایک ممتاز شاعر تھا۔ عباسی دور میں ایرانی اثرات سوسائٹی پر اثر انداز ہوچکے تھے۔ لہٰذا اس کے اندر جو بے راہ روی اور خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ اس کی ذاتی خرابیاں نہ تھیں۔ بلکہ وہ اس دور کی خرابیاں تھیں جن سے

وہ متاثر ہوا۔ وہ غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کی ساری زندگی امراء اور عمائد کے درمیان گزری اور اعلیٰ سوسائٹی میں جو خرابیاں پائی جاتی تھیں وہ اس میں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔

بچپن ہی سے اسے دوسروں کا دست نگر رہنا پڑا اس کے ساتھ ہی اس کا حسن وجمال امراء کی جاذبیت کا سبب بنا۔ عرب سوسائٹی بہت سی خرابیوں سے ناآشنا تھی لیکن اس میں ایرانی اثرات زہر قاتل کی طرح عباسی دور میں سرایت کر گئے تھے۔ تقریبات بھی ایرانی اثر سے خالی نہیں تھیں۔

ابونواس ایرانی النسل تھا۔ وہ والبہ کا شاگرد تھا۔ والبہ کی صحبت کا بھی اس پر برا اثر پڑا۔ حتیٰ کہ جنسی برائیاں بھی اس میں پیدا ہوگئیں۔ جو دراصل عہد و ماحول کی پیداوار تھیں۔ چنانچہ اس کی شاعری میں وہ عنصر بھی پایا جاتا ہے جس سے ابھی تک عربی شاعری خالی تھی۔ اس نے پہلی بار عربی شاعری میں ان برائیوں کو نظم کیا جو عربی شاعری میں مفقود تھیں۔ حسبِ ذیل اشعار اس کی اسی طرز کی شاعری کا نمونہ ہیں:۔

ولقد ابیت علی السریر منعماً　　　ما بین غانید وبین غلام

فاینکھا وینکنی وا نیکہ　　　التذ من خلف ومن قدام

وناھد اللہ یبین من خدم القص　　　سبت بحسن الجید والوجہ والنحر

کلفت بما ابصرت من حسن وجھھا　　　زمانا وما حب الکواعب من امری

الیٰ ان اجابت للوصال واقبلت　　　علی غیر میعاد الی مع العصر

فقلت لھا اھلاً ودارت کؤوسنا　　　بمشمولہ کالورس اوشعل الجمر

فقالت عساھا الخمر انی بریئة　　　الی اللہ من وصل الرجال مع الخمر

فقلت اشربی ان کان ہذا ابحرماً — ففی عنقی یا ریسم وزرک مع وزری

فطالبتہا شیئاً فقالت بعیرہ — اموت اذن منہ ودمعتہا تجری

فمازلت فی رفق ونفسی تقول لی — جویریۃ بکر وذا اجزع البکر

فلما تواصلنا توسطت لجۃ — غرقت بہا یا قوم من لجج البحر

فصحت اغثنی یا غلام نجاءنی — وقد زلقت رجلی ولجلجت فی البئر

فلو لا اصیاحی بالغلام مردانہ — تدارکنی بالحبل صرت الی القعر

فالیت الا ارکب البحر غازیا — حیاتی ولا سافرت الا علی الظہر

جنان سے عشق

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابونواس نے شادی نہیں کی لیکن بعض کہتے ہیں کہ شادی کی لیکن اپنی بُری عادتوں کی وجہ سے بہت جلد ترک تعلق کی نوبت آگئی۔ اس کی شاعری میں بھی اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ اس کو جنان نامی ایک باندی سے محبت ہوگئی تھی۔ اس کی تعریف میں اس نے بہ کثرت اشعار کہے۔ لیکن جنان اس پر غصہ اور ناپسندیدگی ظاہر کرتی تھی۔ تاہم مشروط طور پر شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی لیکن ابونواس اپنی بُری عادت کی وجہ سے اس سے مشروط طور پر شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ وہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کے قبیلہ سے تھی۔ ابوالفرج اصفہانی نے جنان سے اس کے عشق کا قصہ تفصیل سے بیان کیا ہے[۲۷]۔ ابونواس نے یہ اشعار اس کے عشق میں کہے:

اتانی عنک سبک لی فسبی — الیس جری بفیک اسمی فحسبی

وقولی ما بدالک ان تقولی — فما ذا کلہ الا لحسبی

فصار لہ الرجوع الی وصالی — فما تھوین من تعذیب قلبی

تشابہت الظنون علیک عندی — وعلم الغیب فیما عند ربی[۲۸]

(ترجمہ: تمہارا مجھ کو بُرا کہنا مجھ تک پہونچا۔ تم مجھے اور بُرا بھلا کہو۔ کیا تمہارا میرا نام لینا میرے لیے خوشی کا باعث نہیں ہے کہ تم میرا نام لو۔ جو چاہو کہو میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ محبت کی بنا پر ہے اور اس کا نتیجہ مجھ سے میل ہوگا۔ میرے دل کو تکلیف دینا معمولی بات نہ سمجھو۔ تمہیں میری طرف سے بدگمانیاں ہیں لیکن صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔

اسی سلسلہ کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

یشارطنی الحبیب علی الشروط — ولست بما یشارط بالسخوط

اری ترک اللواط علی عار — لانی واحد من قوم لوط[۲۹]

شکاریات سے متعلق شاعری

ابونواس نے پہلی مرتبہ شکاریات پر شاعری کی ہے۔ اس نے اس شاعری میں گھوڑوں، کتوں اور شکرے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح کی شاعری میں اس نے بدوی زندگی کے اس پہلو کو اچھی طرح نمایاں بھی کیا ہے اور اس کو نئے انداز سے بھی پیش کیا ہے۔ شکاریات سے متعلق اس کی شاعری میں عربی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے[۳۰]۔

شاعری کا ضایع ہونا

ابونواس نے مصر میں جو شاعری کی تھی اس کا بیشتر حصہ ضایع ہوگیا اور عراق والے اس سے بے خبر ہے۔ اس کے برعکس بہت سے اشعار اس سے غلط منسوب بھی کر دیے گئے ہیں[۳۱]۔

(باقی)

حواشی

۱ التاریخ الکبیر لابن عساکر جلد چہارم صفحہ ۲۵۴، مطبع روضۃ الشام ۱۳۳۲ھ ۲ طبقات الشعراء فی مدح الخلفاء والوزراء لعبداللہ ابن معتز ص ۸۰، مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس

لندن ۱۹۳۹ء [3] وفیات الاعیان ص ۱۸۹ [4] طبقات الشعراء ص ۸۰ [5] دی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج اول ص ۱۴۳، مطبوعہ لوزک کمپنی لندن ۱۹۳۴ء ۔ (The Encylopadia of Islam V.I, P. 143 Printed by Lusac & Co. London. 1934) [6] اخبار ابی نواس لابن منظور المصری، ص ۴ مطبع الاعتماد بمصر ۱۹۲۴ء/ ۱۳۴۳ھ [7] طبقات الشعراء ص ۸۰ [8] اخبار ابی نواس ص ۳ [9] ایضاً ص ۲۳ [10] ایضاً ص ۲۸ [11] ایضاً ص ۸ [12] ایضاً ص ۸۰ و طبقات الشعراء ص ۸۰ [13] طبقات الشعراء ص ۸۰ [14] التاریخ الکبیر ج ۴، ص ۳۵۵ [15] اخبار ابی نواس ص ۲۷ [16] لٹریری ہسٹری آف دی عربس ص ۲۹۲ (A Literary History of the Arabs . P 292.) [17] دیوان ابونواس ص ۸۰، مرتبہ محمود کامل فرید، مطبوعہ مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ بمصر ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء [18] اخبار ابی نواس ص ۱۲۱ [19] ایضاً ص ۱۴۷ - ۱۴۸ [20] دیوان ابونواس ص ۱۹۸ [21] التاریخ الکبیر ج ۴ ص ۲۷۹ [22] دیوان ابونواس ص ۱۹۷ [23] ایضاً ص ۱۹۰ و اخبار ابی نواس ص ۹۲ [24] اخبار ابی نواس، ص ۹۶ - ۹۷ و دیوان ابونواس ص ۳۱۱ [25] الاغانی ج ۱۸، ص ۲ للامام ابی الفرج الاصفہانی، مطبوعہ مطبعۃ التقدم بمصر [26] اخبار ابی نواس، ص ۱۰۹ [27] ایضاً ص ۱۸۹ [28] و [29] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱، ص ۱۴۴ [30] رسائل الانتقاد الشیخ محمد کرد علی ص ۲۴۸ [31] دیوان ابونواس ص ۸۶ ۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط - مہاراشٹر

(۲)

۶ - کلام شاد پر مقدمہ :- شاد عظیم آبادی شعرائے متاخرین میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان کا نام سید علی اور تخلص شاد تھا ۔ آغاز شباب ہی سے ذوقِ شاعری شباب پر تھا ۔ پٹنہ کے کہنہ مشق استادِ سخن حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا ۔ جن کے سینکڑوں شاگرد سارے صوبۂ بہار میں پھیلے ہوئے تھے اور اپنی طبعِ شاعرانہ کے جوہر دکھا رہے تھے ۔ لیکن ان سینکڑوں شاگردوں میں شاد اور سید امداد امام اثر کا ہم پلہ اور صاحبِ سخن دوسرا کوئی نہیں ہوا ۔ شاد بہت زود گو تھے اور ہر صنفِ شاعری پر طبع آزمائی کرتے تھے، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، مثنوی، سلام، قطعہ اور فرد وغیرہ کی وافر مقدار انہوں نے اپنے ورثے میں چھوڑی ہے، لیکن ان کی حیات میں جو مجموعۂ کلام شاد شایع ہوا وہ نہایت قلیل، غیر مرتب و غیر منتخب کلام پر مشتمل تھا ۔ دنیائے سخن میں جس نے مسلسل ساٹھ سال تک ریاض کیا ہو اس کا اتنا مختصر دیوان دیکھ کر مقدمہ نگار (حضرت سید سلیمان ندوی) کو بڑی کوفت ہوئی اور بے ساختہ ان کی قلم سے یہ جملے نکل پڑے ۔

" اس وقت تک جو سرمایۂ سخن منتشر اوراق کی صورت میں ہے، اس کا اندازہ ایک لاکھ

سے کم نہیں ۔۔۔۔ ایسے وسیع سرمایہ کو پیش نظر رکھ کر یہ پونے دو سو صفحات کا غیر منتخب دیوان غزلیات کو دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ جواہر سخن کے بے شمار انبار میں سے صرف یہ چند دانے قدردانان شاد کے دامن شوق میں آسکے :

اگرچہ شاد ان کے معاصرین میں سے تھے اور شاد کا کلام بارہا ان کی نگاہوں سے گزرتا رہا تھا پھر بھی مولانا سید سلیمان ندوی نے شاد کی اصلی دولت کا اندازہ اس مختصر سے دیوان سے لگا لیا اور صاف کہہ اٹھے ۔

" موجودہ استادوں میں شاید حضرت شاد کا ہمعصر کوئی دوسرا نہ نکل سکے ، جس نے ہماری محفل ادب کا پچھلا سماں دیکھا ہو، استادان کہن کی صحبت اٹھائی ہو اور ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع کی بندش اور ایک ایک لفظ اور محاورہ کی تلاش میں خواب و خور اپنے اوپر حرام کر لیا ہو "

شاد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے انہیں " اس دور کا میر " کہا ہے اور ان کی شاعری میں لفظی حیثیت سے لکھنوی اور معنوی اعتبار سے دہلوی انداز تلاش کیے ہیں ۔ مقدمہ کے شروع میں پٹنہ عظیم آباد کے ادبی مرکز بننے کی اجمالاً تاریخ اور بساط سخن بچھنے کی اور الٹنے کی مختصر داستان بیان کر دی ہے ۔ جس سے وہاں کے قدیم علمی وادبی ماحول کا پتہ چلتا ہے اور بزم شعر و سخن کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے ۔

۷ ۔ **مقدمہ یادگار عشق :** شعرائے متقدمین میں حضرت شاہ رکن الدین ابوالعلائی معروف بہ شاہ گھسیٹا المتخلص بہ عشق شاہجہاں آبادی شعرائے عظیم آباد میں میر حسن دہلوی کے معاصر نہایت پرگو اور زود سخن شاعر گزرے ہیں ۔ تذکرہ نویسوں نے بڑے ادب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے ۔ اردو شعری روایات کے بموجب عشق نے بھی غزل میں عشقیہ

و متصوفانہ مضامین کو برتا ہے ۔ ان میں مظہر جان جاناں اور درد کا رنگ نمایاں ہے ۔ ان کے تغزل میں حسن کی عشق پر بالادستی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ "حسن رہگذر" نہیں "جمال لم یزل" ہے ۔ عشق کا تصوف ابوالعلائی مسلک کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے ۔

مقدمہ نگاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ " مروت و شرافت " اس میں " نقد " کا خون کر دیتی ہے ۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدموں میں نہ صرف یہ کہ تنقید کا پورا پورا حق ادا کیا ہے بلکہ تحقیقی زاویوں سے بھی کتاب کو دیکھا ہے ۔ " یادگار عشق " کے مقدمہ میں تو تنقید و تحقیق دونوں شیر و شکر بن گئے ہیں ۔ اس مقدمہ میں جہاں سید صاحب نے عشق کی شاعری کا جائزہ لے کر اس کے خط و خال دکھائے ہیں وہاں تحقیقی پہلو اختیار کر کے عظیم آباد کی شعری و ادبی تاریخ کی روشنی میں عشق کے مقام کا تعین بھی کر دیا ہے ۔ اس مقدمہ میں " متنی تنقید " کا سہارا لے کر اور قدیم تذکروں اور عشق کے دیوان کے مخطوطوں کا نہایت ژرف بینی سے جائزہ لے کر صحیح متن کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ وقت طلب کام مولفین و مرتبین کے کرنے کا ہوتا ہے لیکن مقدمہ لکھتے وقت سید صاحب اس تکلیف دہ محنت کو بھی اخلاص کے ساتھ جھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ عشق کے کلیات کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" حضرت عشق کے کلام کا انداز وہی ہے جو حضرت مظہر اور خواجہ درد کا ہے ۔۔۔ صوفیانہ مضامین کی آمد وہی ہے جو درد میں ہے مگر درد کا مختصر سا بیان غم یعنی ان کا " دو جزء " کا مختصر سا دیوان عشق کے ۵۰ جزء کی شرح الم یعنی ان کے کلیات کے ساتھ سمندر اور قطرہ کی نسبت رکھتا ہے "

انہوں نے " مخطوطہ یادگار عشق "، " تذکرہ میر حسن " اور " گلشن ہند " سے تلاش کر کے

عشقؔ کے کلام کو ناظرین کے سامنے اپنے مقدمہ میں بطور مثال پیش کیا ہے عشقؔ کے عاشقانہ کلام پر اپنی رائے دیتے ہوئے سید صاحب کہتے ہیں:

"حضرت عشقؔ کے عاشقانہ کلام کی اصلی خوبی سادگی، لطافت، جوش بیان اور روانی ہے۔ مصرعوں میں اتنی برجستگی ہوتی ہے کہ ہر شعر خوبی و وضاحت کی ایک صاف و مصفا سلسبیل ہے، نہ اشکال ہے نہ ثقلِ ترکیب ہے۔ مضامین پامال اور ابتذال کے خس و خاشاک سے پاک"۔

اس مقدمہ میں سید صاحب نے عشقؔ کے عارفانہ اور عاشقانہ اشعار کا انتخاب کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی شاعری کے یہ دونوں دھارے علیحدہ علیحدہ بہتے محسوس ہوتے ہیں۔ ورنہ بارہا یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر کے عشقیہ اشعار کو کھینچ تان کر عارفانہ (متصوفانہ) بتانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اس کے ٹھیک برعکس بھی عمل کیا جاتا ہے لیکن سید صاحب نے عشقؔ کے ان دونوں جذبات کے حامل اشعار میں امتیاز و فصل قائم کیا ہے۔

۸۔ مقدمہ شعلۂ طور: شہنشاہِ تغزل جگر مرادآبادی دورِ جدید میں غزل کی آبرو اور قدیم روایاتِ شاعری کے پاسدار تھے۔ انہوں نے عروسِ غزل کو جتنا سنوارا، سجایا اور اس کے حسن میں اضافہ کیا، اس کی مثال غالب کے بعد اردو ادب میں جگرؔ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کی نہیں ملتی۔ ایک منحنی، کمزور، غیر جاذبِ نظر شاعر اپنے عینکوں کی پیٹی لے کر جب واردِ اعظم گڑھ ہوتا ہے تو اس کی آواز کی نرمی اور کلام کی شیرینی سید صاحب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ شبلی منزل میں اس نووارد شاعر کو جب بحیثیت شاعر متعارف کرایا گیا تو اس وقت وہاں حاضرین میں مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور پروفیسر عبدالباری وغیرہ موجود تھے، ان کی نظریں اس مہمان شاعر کی طرف اس کے تبسم کی

وجہ سے اٹھیں۔ لیکن شاعر نے غزل کے دو شعر ہی عجیب درد انگیز ترنم کے ساتھ سنائے تھے کہ ان سبھی ذی علم مدبروں کو سنبھل جانا پڑا۔ اب ظرافت متانت میں بدل گئی، تبسم کی نگاہ میں تحیر پیدا ہوگیا اور سامعین احسنت و مرحبا کہنے لگے۔ شبلی منزل میں تحسین و آفرین اور عزت و توقیر جس کا مقدر بن جائے وہ بھلا معمولی شاعر کیسے ہو سکتا ہے؟ سید صاحب نے اس نووارد شاعر کی جی کھول کر تعریف کی لیکن دیانت اور سچائی کے ساتھ۔ اس میں مبالغہ آرائی اور جھوٹی تعریف کا شائبہ نہ تھا۔ زیرِ نظر مقدمہ میں جگر مرادآبادی کے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، بے تکلف، تعمق اور آورد سے پاک ۔۔۔۔ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرایش اور از خود نمایشِ حسن ہے۔ جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر جب کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے"۔

اس مقدمہ میں سید صاحب نے نہ صرف یہ کہ جگر کے کلام کا جائزہ لیا ہے بلکہ شاعری کے لیے جن ذہنی و قلبی کیفیات اور جذبات و تفکرات کی ضرورت ہوتی ہے ان کو بھی واضح کیا ہے، اور اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ:

"جگر مستِ ازل ہے اس کا دل سرشارِ الست ہے وہ محبت کا متوالا ہے اور عشقِ حقیقی کا جویا۔ جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو"۔

۹۔ خمستان: یہ مجموعۂ کلام عبد السمیع پال اثر صہبائی کا ہے جو سیالکوٹ (پنجاب) کے متوطن تھے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد مولوی احمد دین پال کے سایۂ عاطفت میں ہوئی جو جماعت اہل حدیث میں ممتاز فاضل بزرگ تھے۔ صہبائی نے تحصیل علم میں ترقی کرتے ہوئے فلسفہ میں سندھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ گھر کے مذہبی ماحول اور فلسفیانہ تعلیم نے ان کے مزاج کی جس طرح تشکیل کی اس کے ارتسام نقش صہبائی کی شاعری میں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ چاہے وہ رباعیات ہوں یا غزلیں، مراثی ہوں یا نظمیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس نوجوان ۳۲ سالہ شاعر صہبائی کے شعری مجموعہ "خمستان" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

"ان (صہبائی) کی شاعری میں سرور و شادمانی نہیں بلکہ حزن و ملال ہے اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھوں میں آنسو نہیں بلکہ صبر و سکون اور تسلی و تعزیت کے غمگین فلسفیانہ اشارات ہیں اور ان کی غزلوں میں محبت کے اثرات اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق و محبت کے حکیمانہ رموز و اسرار فاش ہوتے ہیں۔"

سید صاحب نے نہایت باریک بینی سے صہبائی کی شاعری کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے، ساتھ ہی اہل حدیث شعرا و ادبا کی ادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اردو ادب میں ان کے ادبی مقام کا تعین سید صاحب نے اس انداز میں کیا ہے کہ اب شاید ہی اس میں کچھ ردوبدل کے امکان رہ گئے ہوں۔ اگرچہ سید صاحب نے یہ باتیں برسبیل تذکرہ لکھ دی تھیں لیکن تا حال تو یہ حرف آخر ہی رہی ہیں۔

سید صاحب کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی رہی ہے کہ "نقص"، "وصف" بن کر ابھرتا ہے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری "ایڈیٹر" اہل حدیث" کے صحیح شعر نہ پڑھنے کے

نقص کو وہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"کیونکہ وہ متبع سنت (اہل حدیث) ہیں اس لیے صحیح شعر کے نہ پڑھنے میں بھی سنت سنیہ کی تقلید کرتے ہیں۔ ماعلمناہ الشعر و ماینبغی لہ"۔

قرآن سے استدلال کرکے اگرچہ سید صاحب نے ایڈیٹر" اہل حدیث" کی خامی کو خوبی میں بدل دیا ہے لیکن ان جملوں میں چھپے کرارے طنز کو اہل نظر ہی خوب سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ "اہل حدیث" "متبع رسول ہوتے ہیں" "مقلد ائمہ" نہیں ہوتے۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ شعر پڑھنے میں اکثر چوک جایا کرتے تھے۔ سید صاحب نے مولانا ثناء اللہ کے صحیح شعر نہ پڑھنے کی خامی کو نص و احادیث سے جوڑ کر گویا یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی یہ خامی بھی سنت رسولؐ کی اتباع کا نمونہ ہے۔

صحت کلام کے لیے سید صاحب "تعجیل" کے بجائے "تاخیر" پر زور دیتے ہیں کہ عجلت میں پیش کیا گیا ادب ناپختہ اور غیر موثر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں "کلیات" کے بجائے "انتخاب" کو پسند کرتے ہیں کیونکہ منتخبہ کلام عیوب و نقائص اور اسقام و اغلاط سے پاک ہوتا ہے اور اس کی مقبولیت دیر تک قائم رہتی ہے۔

اس مقدمہ میں صہبائی کے بعض اشعار پر اصلاح بھی دی ہے جو سید صاحب کے ماہر فن اور سخن پرور ہونے پر ٹھوس شہادت بہم پہونچاتی ہے۔

۱۰۔ مقدمہ مسدس حالی: مولانا الطاف حسین حالی کے مسدس پر سید سلیمان ندوی کا یہ مقدمہ کتاب کے چھپنے اور قبول عام کی سند پانے کے انسٹھ سال بعد لکھا گیا۔ یاد رہے کہ "مد و جزر اسلام (مسدس حالی) پہلی بار ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ میں چھپی تھی۔ عوام میں اس کی پسند کا یہ عالم تھا کہ ۵۰۔۶۰ برسوں میں اس کے بند کے بند بچوں سے

لے کر بوڑھوں تک کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور میلاد کی محفلوں میں گا کر اس کے مذہبی تقدس کی گواہی دی جا رہی تھی۔ بہ ایں صورت مسدس حالی پر مقدمہ لکھنا عبث ٹھہرتا لیکن سید صاحب کے سحر طراز قلم نے مسدس کے پنہاں گوشوں اور مستور زاویوں کو اس انداز میں نمایاں کیا کہ مسدس کو نہ چاہنے والے بھی اب اس کے شیدائی بن گئے۔ سید صاحب کے قلم کا یہ وصف رہا ہے کہ وہ کتاب کا ریویو تبصرہ، تجزیہ یا مقدمہ تحریر فرماتے ہیں تو کتاب اور صاحب کتاب کی بین السطور چھپی ہوئی خوبیوں کو پیش کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ پھر نفس مضمون کے اعتبار سے ساری تاریخ کا منظر نامہ ایسا پیش کرتے ہیں کہ واقعات نظروں کے سامنے مستحضر ہونے لگتے ہیں جس سے کتاب کا قاری خود بخود اس کی افادیت کو تسلیم کر لیتا ہے اور مخالف کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسٹھ سال سے مسدس کی مقبولیت کے ساتھ ہی اس کی جو مخالفت ہو رہی ہے سید صاحب نے اس مقدمہ کی اشاعت (۱۹۳۵ء) کے بعد ختم ہو گئی یا کم از کم اس کا زور جاتا رہا۔ آپ نے مسدس کے موضوع پیش کرنے کے انداز اور حالی کی مسحور کر دینے والی شاعری کو مسدس کی مقبولیت کی وجہ بتائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"بغداد کی تباہی پر سعدی نے ماتم کیا اور ابن ابی الیسر نے خون کے آنسو روئے اور اندلس مرحوم کی بربادی پر ابن بدرون نے اپنا دلدوز نوحہ سنایا، لیکن افسوس کہ ہندوستان کے انقلاب پر چوبیس برس گزرنے کے بعد بھی کسی کو آنسو کے قطرے گرانے کی توفیق نہیں ملی۔ دل بھرے تھے، آنکھیں رونے کو اور ہاتھ سینہ کوبی کو تیار تھے۔ مسدس نے مرثیہ کا کام کیا اور لوگ اس کو پڑھ پڑھ کر دل کھول کر روئے۔ ایک درد بھری داستان تھی جس کو جس نے سنا بے تاب ہو گیا۔"

حالی نے چونکہ پستی و تنزل کے حالات میں عروج و عظمت کی داستان سنائی تھی اس لیے اسے سن کر بقول سید صاحب "فقیری میں بادشاہی کا مزا آ گیا، ان کے جھکے ہوئے سر غرور سے اونچے ہونے لگے"۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ ملت کے افراد نے اسے پسند کیا۔ مسدس کی مقبولیت کی تیسری وجہ مثنوی کے بجائے مسدس کے فارم میں اسے منظوم کرنا ہے۔ اس پر طرفہ حالی کا اپنا انداز بیان، نظم کی سلاست، روانی اور برجستگی وغیرہ تمام فنی لوازمات۔ غرضکہ مسدس حالی کی ہر دل عزیزی کے تمام وجوہ سید صاحب نے بالتفصیل بیان کر دی ہیں۔ آخر میں مسدس کی اثر آفرینی کے متعلق نہایت جذباتی انداز میں فرمایا:

"اس مسدس کی تالیف پر نصف صدی سے زیادہ گزر چکی ہے، مگر اس کے اثر کی تازگی کا اب بھی وہی عالم ہے، امید ہے کہ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی جائیں گی، لیکن ان اوراق پر سچائی اور اخلاص ملت کی تاثیر سے کہنگی نہ آئے گی، یہ خود حیات جاوید پائے گا اور اپنے مصنف کو حیات جاوید بخشے گی اور جیسے اس دنیائے فانی میں وہ اس کی شہرت کا سبب بنی، اس دنیائے باقی میں اس کی مغفرت کا سامان بنی ہو گی۔"

۱۱۔ مقدمہ خیابان: "خیابان" محمود اسرائیلی کا مجموعۂ کلام ہے جو اکثر اخباروں اور رسالوں کی زینت بنتا رہتا تھا۔ اگرچہ اردو ادب میں محمود اسرائیلی اتنے معروف نہیں پھر بھی بہ تعلق خاطر حبیب گنج اس مجموعۂ کلام پر بھی مقدمہ لکھا، شاعر کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ان کی (محمود اسرائیلی) اخلاقی اور تاریخی شاعری میں شبلی کا تخیل ہے ان کی سیاسی اور وطنی شاعری میں ظفر علی خاں کی پُرکاری ہے، ان کی حقیقت شناسی اور اتحاد اسلامی کے ساز میں اقبال کا ترانہ ہے۔۔۔ غرض وہ اسلام کے ہندی شاعر یا ہندوستان

کے مسلمان شاعر ہیں اور ہندی مسلمانوں کے سامنے ملک وملت اور دین وسیاست
کے حقیقی انوار اور واقعی اسرار آشکار کرتے ہیں اور ہندی مسلمانوں کو اسلامی جذبات
اور وطنی خدمات کے لیے یکساں دعوت دیتے ہیں"۔

اس تجزیہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ شاعر کے یہاں چونکہ ملی حمیت اور
وطنی خدمات کا جذبہ موجود ہے (اور یہ دونوں جذبات سید صاحب ہر ہندی مسلمان کے
یہاں ضروری سمجھتے تھے) اس لیے بہ صمیم قلب یہ مقدمہ تحریر فرمایا۔ سید صاحب نے اس
مقدمہ میں بر سبیل تذکرہ ایک بحث چھیڑی ہے جو اگرچہ نہایت اہم ہے لیکن اس مقدمہ
میں شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں! یہ بحث مسدس حالی کے مقدمہ میں ہوتی تو
زیادہ بہتر ہوتا۔ اس بحث کی حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی روانگی کے وقت سید صاحب
نے معارف کی ادارت مولانا عبدالماجد دریابادی کو سپرد کی تھی اور اس دوران معارف
میں چھپے مولانا کے شذرات سے سید صاحب مطمئن نہیں تھے۔ درایں اثنا فروری ۲۰ء
کے شمارے میں مولانا دریابادی کے قلم سے یہ جملے نکل گئے:

"خسرو کو تلاش کرو، تغلق کی نہیں، سعدی چاہیے، سعد زنگی کی حاجت نہیں،
حافظ مطلوب ہے، شاہ شجاع نہیں۔ ابن رشد کو ڈھونڈو، حکم کو نہیں شیخ الاشراق
بس ہیں، سلطان ایوبی درکار نہیں۔ ابن سینا سے مطلب ہے خوارزم شاہ اور
ابوالمعانی قابوس سے نہیں"۔

شذرات کا یہ حصہ پڑھ کر لندن سے سید صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی
کو لکھا:

"میں قطعاً آپ کی رائے کا موید نہیں ہوں۔ میرے امن طلب دوست اور سکون پسند

فلسفی! تخیل اور عمل دو مختلف عالم ہیں۔ تغلق نے خسرو کو پیدا کیا، اکبر نے عرفی کو
نشوونما دی۔ قابوس وخوارزم شاہ نے ابن سینا کو ابن سینا بنایا۔ دولت سامانی
نہ ہوتی تو ابن سینا کو گنجینۂ علوم کتب خانہ میسر نہ آسکتا تھا۔ سلجوق وترک نہ
ہوتے تو جلال الدین رومی ایشائے کوچک کی سرزمین میں پیدا نہ ہوتے۔۔۔۔
خیام کا پرسکون دماغ ملک شاہ سلجوقی کی تلوار کے سایہ میں آرام پارہا تھا"۔
(برید فرنگ ص ۵۳)

یہ بحث دونوں کے درمیان کافی دنوں تک چلتی رہی اور ایک دوسرے کے لیے
شاید بدگمانی کا سبب بھی بن گئی تھی۔ سید صاحب مولانا کی اس رائے سے متفق نہ ہوسکے
بلکہ اپنے اختلاف کو جب بھی موقع ملتا برابر ظاہر کردیتے۔ چنانچہ کم وبیش سترہ سال بعد
یعنی ۱۹۳۷ء میں جب "خیابان" کا مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی تو بر سبیل تذکرہ اپنے
پرانے اختلاف کو اس جگہ پیش کردیا۔ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا میں سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا
کیا۔ اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفریں عہد پیدا نہ کرتی تو رستم وسہراب اور کیکاؤس و
افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑسکتی تھی"۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کشور کشا سلاطین کے دور ہی میں اچھا ادب پروان
چڑھتا ہے۔ چونکہ محمد شاہ اور ظفر غلام بادشاہ تھے اس لیے ان کے دور میں ذوق وغالب
لاکھ زور لگانے پر بھی عنصری، عرفی وکلیم تک نہ پہونچ سکے۔ غرضکہ اس بحث کو سید صاحب
نے اس مقدمہ میں پیش کردیا۔ پھر اپنے مدعا کی طرف لوٹتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اب چونکہ
شخصی حکومتیں نہیں رہیں۔ زمانے کے نئے انقلاب نے اب یہ طاقت جمہور کے اندر پیدا

کردی ہے۔ اس لیے .... قوم کی فاتحانہ اور اولوالعزمانہ طاقت اہلِ سخن اور اصحابِ قلم کے سینوں میں جوش، زبان میں تیزی اور قلموں میں روانی پیدا کرتی ہے"۔ ہندوستان میں انقلاب کے بعد اردو ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دلی کی سلطنت نکل جانے کے بعد ..... حالؔی خود روتے اور دوسروں کو رلاتے رہے، اکبرؔ کے دور میں ذرا لبوں پر مسکراہٹ آئی اور نوحہ و ماتم کی جگہ طعن و طنز نے لی، شبلؔی نے رجز خوانی شروع کی .... اقبالؔ آئے تو قوم کا قافلہ سفر کو آمادہ ہوچکا تھا۔ اس لیے وہ "بانگ درا" کے ساتھ آئے .... بڑی لڑائی کے بعد سیاسیات کے انقلاب کا رخ جب سے بدلا ہماری نئی شاعری کا رنگ بھی بدل رہا ہے۔ اس انقلاب نے ہماری زبان میں بہت سے اچھے اچھے سخنور پیدا کیے۔ زمانۂ حال کے ان نئے خوش فکر شاعروں میں ایک اس مجموعہ کے مصنف محمود اسرائیلی صاحب ہیں"۔

اس کے بعد سید صاحب نے شاعر کے متعلق وہ تمام باتیں بیان کی ہیں جو اوپر درج ہوچکی ہیں۔ آخر میں "خیابان" کے "خس و خاشاک" کی طرف بھی آپ نے اشارہ کیا ہے اور اسے ان سے پاک رکھنے کی تمنا بھی کی ہے۔

۱۲۔ **مقدمۂ عطرِ سخن**: یہ ڈپٹی مولوی سید یوسف حسین صاحب ساکن چھپرہ ضلع سارن صوبۂ بہار کی تالیف ہے۔ انہوں نے نسیمِ سخن، غنچۂ سخن، گلِ سخن، عطرِ سخن اور روحِ سخن کے ناموں سے پانچ انتخابات تیار کیے تھے جن میں اردو شعراء کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ سید صاحب نے ان پانچوں انتخابات میں سے عطرِ سخن پر مقدمہ تحریر فرمایا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے طلبہ کے معیار کو ذہن میں رکھ کر یہ انتخابات ترتیب دیے تھے، تاکہ کالج کے اعلیٰ درجہ سے لے کر اسکول کے درجوں تک بہ ترتیب یہ انتخابات نصابِ درس

میں جگہ پاسکیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو عربی مدارس کی نصابی کتابیں تیار کرنے کا تجربہ تھا۔ اس لیے اس انتخاب کو معیارِ اصولِ تعلیم اور تعلیمی نفسیات کی بنیاد پر پرکھا ہے۔ اپنے ذوقِ سلیم کے مطابق "انتخابات" ترتیب دینے کی تاریخ کو مجملاً بیان کردیا ہے۔ انتخابات کی ترتیب مرتب کے ذوقِ سخن کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ہر ایک کا ذوق مختلف ہے اس لیے ہر ایک کی پسند بھی الگ۔ اس اختلافِ ذوق کی بنیاد پر انہوں نے بھی سخت گیری سے کام نہیں لیا صرف اپنے بعض اعتراضات پیش کردیے۔

۱۳۔ **"حقیقت علمی شاعری"**: کے عنوان سے بھی سید صاحب نے مسٹر نصیر الدین حسین نصیر بیرسٹر ایٹ لا عظیم آبادی کے ایک منظوم رسالے پر مقدمہ لکھا تھا۔ شاعر نے مثنوی کی طرز میں ایک اچھوتے انداز میں اور نئے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس مثنوی میں شاعری کی حقیقت، مختلف ملکوں میں اس کے اثرات اور تاریخ، مختلف قوموں کی شاعری کی خصوصیات اور پھر اردو شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ گویا اس موضوع کے اعتبار سے یہ بالکل ہی نیا تجربہ ہے۔ سید صاحب نے نصیر کی کہنہ مشقی صنفِ مثنوی کا اصنافِ شاعری میں مقام اس کی ہیئت اور ٹیکنک تمام کا احصار نہایت مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے اور یہ مقدمہ لکھ کر حق دوستی ادا کردیا ہے۔ لیکن کہیں مروت راہِ تنقید میں حائل نہیں ہوئی۔ اس مضمون کے شروع میں بھی یہی بات کہی گئی تھی کہ ہو ب کی تنقید میں رواداری اور مروت کے وہ کبھی بھی قائل نہیں رہے۔

اس طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت کو بحسنِ تمام آگے بڑھایا اور نقد و جرح میں اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ یہی خوبی ہے کہ سید صاحب کا مقدمہ قارئین کتاب کو دھوکے میں نہیں ڈالتا اور جو کچھ مقدمہ میں بیان کردیا گیا ہے، قاری کتاب کے صفحات میں "ہو بہو" پالیتا ہے۔

استدراک

معارف (جولائی ۱۹۹۸ء) میں جناب گوردیال سنگھ مجذوب کا مقالہ "سنسکرت زبان کی لغوی برتری" میں نے غور سے پڑھا میرا خیال ہے کہ ان کے متعدد مفروضے صحیح نہیں ہیں، بلکہ بعض تو صریحاً غلط ہیں، چونکہ مجذوب صاحب کے مقالے کا غلط اور گمراہ کن اثر پڑ سکتا ہے، اس لیے یہ سطور قلم بند کی جاتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم زبانوں کے سلسلے میں ایسے مسائل خاصے الجھے ہوئے ہیں اس لیے قطعیت کی گنجائش کم ہے، چنانچہ کوئی تیز ذہن غلط نتائج برآمد کر سکتا ہے، خصوصاً جب کہ اس پر جذبے کا اثر زیادہ ہو۔ ان سب دشواریوں کے باوجود دوسری قدیم زبانوں سے سنسکرت کے رشتوں کی بابت کئی باتیں اس صدی میں تقریباً طے پا گئی ہیں جن سے اس ضمن میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ اولاً تو مجذوب صاحب کے چند غیر معمولی بیانات کی تردید کر دی جائے، ثانیاً اس سلسلے میں مختصراً وضاحت بھی پیش کی جائے۔

مجذوب صاحب کے چند بیانات جو صحیح نہیں معلوم ہوتے، ان کی نمبروار یوں تردید کی جاسکتی ہے:

(۱) ایسا کہنا کم از کم ارتقائی لسانی اعتبار سے غیر مناسب ہے کہ سنسکرت زبان لغوی اعتبار سے برتر ہے۔ انڈو یوروپی زبانوں کے سلسلے میں ایسی بات کسی ایک حد تک درست

رہے گی۔ تفصیل بعد میں آئے گی۔

(۲) پشتو اور سندھی کے قدیم ماخذوں میں سنسکرت لازمی طور پر شامل رہی ہے، لیکن یہ بات فارسی زبان/ایرانی زبانوں کی بابت نہیں کہی جاسکتی۔

(۳) زبانیں مردہ محض سیاسی اقتدار سے محرومی کی بنا پر نہیں ہوتیں، بہت سارے دیگر عوامل موجود ہوتے ہیں۔

(۴) ایسا کہنا اگر سراسر غلط نہیں تو محل نظر ضرور ہے کہ 'حامی' زبانوں کا منبع سنسکرت ہے، اگر 'حامی' سے مراد انڈو یوروپی زبانیں ہیں (یا وہ جو بائیں سے دائیں جانب لکھی جاتی ہیں)

(۵) یہ کیسے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی دنیا کا تمام جغرافیائی رقبہ اسی زبان (سنسکرت) کے زیر اثر رہے، اس کے ہمارے پاس قطعی شواہد بالکل نہیں ہیں یہ ضرور ہے کہ مختلف سنسکرت لغات دوسری زبانوں میں مختلف وجوہ کے تحت داخل ہو گئے ہیں۔ ایسا ہر ایک زندہ زبانوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔

(۶) ایسا کہنا کہ 'چینی، جاپانی، کوریائی، ملیشیائی وغیرہ کی ام اللغات یہی زبان (سنسکرت) ہے'، قطعی غلط مفروضہ ہے۔ چینی اور اس سے جڑی زبانیں 'حامی' زبانوں سے نہ تو نکلی ہیں اور نہ تو ان کی ام اللغات سنسکرت ہے۔ ملیشیائی زبان میں دیگر ہندوستانی لغات مجتمع ضرور ہو گئی ہیں جن کی بڑی وجہ ہند اور ان علاقوں سے تجارتی، ثقافتی اور مذہبی تعلقات رہے ہیں۔ چینی وغیرہ زبانوں میں بودھی مذہبی صحائف، تجارتی تعلقات، نقل آبادی، ترکستانی زبانوں کے اثرات کی وجہ سے سنسکرت اور دیگر ہندوستانی الفاظ ضرور داخل ہو گئے ہیں (ملاحظہ ہو: بودھی اصطلاح، دھیانہ) چینی زبان انڈو یوروپی زبانوں سے

قطعی مختلف ساخت و پیٹرن رکھتی ہے جن کا اصل منبع فینیقی حروف ہجی نہیں ہیں۔ انڈو یوروپی زبانیں جن میں سنسکرت شامل ہے، اسی منبع سے وجود میں آئی ہیں۔

(۷) قدیم بازنطینی اور یونانی تہذیب و تمدن کے لسانی ڈھانچوں نے سنسکرت زبان کے اثرات کو براہ راست قبول نہیں کیا ہے۔ ہیلینی یونانی دور میں (جو کہ اسکندر اعظم کے وفات کے بعد ظہور میں آیا) بودھی اور بالواسطہ ویدی، افکار مشرق وسطیٰ اور بحیرۂ روم کے علاقے میں ضرور پھیلے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کا اثر ضرور ہوا ہوگا۔ جناب مجذوب انڈو یوروپی زبانوں کا مخرج سنسکرت کو سمجھ رہے ہیں، جو کہ بنیادی غلطی ہے۔

(۸) چنانچہ ایسا کہنا بھی مناسب نہیں۔ بلکہ غلط ہے کہ انگریزی زبان نے بنیادی لسانی طور پر سنسکرت زبان سے استفادہ کیا ہے۔ ہزاروں ہندوستانی الفاظ انگریزی لغت میں پچھلے دو سوا دو سو سال میں ضرور شامل ہو گئے ہیں، کچھ ایسے ہی کہ جیسے آج پچھلے دس پندرہ سالوں سے اردو/فارسی الفاظ ہندی لغت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں، یا جیسے کہ اردو زبان نے انگریزی اور دیگر جدید یوروپین زبانوں سے لغات اپنا لیے ہیں۔

(۹) مزید ایسا کہنا بھی غلط ہے کہ 'انگریزی اور فارسی (جملہ ایرانی؟) زبان کے پاس اپنے کوئی موروثی الفاظ موجود نہیں تھے اسی لیے ان ہی الفاظ کی مستقل حیثیت قرار پا گئی ہے۔ انگریزی اور فارسی زبانیں ہندی، بنگالی، اوڑیہ جیسی زبانیں نہیں ہیں۔ ان کا منبع انڈو یوروپی مخرج ہے۔

(۱۰) ایسا دعوا میرے خیال سے اب تک کسی ماہر لسانیات و فرہنگ نے نہیں کیا ہے کہ 'انگریزی زبان کی ڈکشنری کا تقابلی مطالعہ اور لفظوں کی مشابہت اور ان کے

حروف کی ترکیبی بیت پر نظر ڈالنے سے یقیناً بیشتر الفاظ بڑی حد تک کلی یا جزوی طور پر سنسکرت زبان سے ہی ماخوذ نظر آئیں گے، بلکہ بعض صورتوں میں مطابقت سو فی صد دکھائی دے گی، یہ بہت بڑا دعوا ہے۔ موصوف کو ولیم جونز بن کر اس کام کو انجام دینا ہوگا۔ دس پندرہ لفظوں کی باہمی مشابہت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ موصوف نے جن چند الفاظ کی بابت کہا ہے کہ وہ سنسکرت سے آئے ہیں، بظاہر ہزاروں الفاظ ایسے ہی دکھائی دیں گے۔ (اگر تلاش کیا جائے تو مثلاً روسی یا پولش زبانوں میں بھی ایسے الفاظ دکھائی دے جائیں گے) ایسا لگتا ہے کہ آں جناب نے انڈو یوروپی زبان کی تھیوری پر نظر نہیں ڈالی ہے اور پچھلے دو سو برسوں میں اس سلسلے میں کام سے لاپرواہی برتی ہے۔ تحقیق میں غلطیاں ہوتی رہا کرتی ہیں، لیکن کئی ایک بنیادی مسائل پر مکمل اتفاق ہے۔ انڈو یوروپی زبانوں کے سلسلے میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اسے ناقابل اعتنا سمجھنا علمی غیر دیانت داری اور علمی مفلسی کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا۔

(۱۱) کوئی وجہ بظاہر ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ ان الفاظ کا 'لسانی منبع و اصلی مرجع'، جیسے کہ موصوف نے مختصر سے گوشوارے میں مندرج کیا ہے، سنسکرت زبان ہے ثبوت پیش نہیں کیے گئے کہ سنسکرت کے ایسے لغت (یا جتنے وہ جو مندرج ہیں) کیونکر انگریزی لغت میں جا کر ضم ہو جائے۔ اگر بڑی آکسفرڈ انگلش ڈکشنری کو دیکھا جائے تو پتہ چلے کہ اس عظیم فرہنگ میں تقریباً سارے ہزارہا ہزار الفاظ کے ابتدائی استعمال کی تاریخیں درج کی گئی ہیں اور ان کے وجود میں آنے اور تبدیل ہونے کی تاریخیں۔ ایسا کام دوسری زبانوں میں بہت کم ہوا ہے۔ جرمن اور فرنچ زبانوں کے علاوہ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے مستعار لیے ہوئے الفاظ کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر جناب مجذوب کہتے ہیں کہ

انگریزا اور دیگر فرہنگ نویسوں کو اصلی حقیقت معلوم نہیں تو آپ معاف کریں، یہ محض ہٹ دھرمی ہے۔ علمی بحث نہیں۔

(۱۲) جہاں تک سوابق یعنی Prefix اور لواحق یعنی Suffix کا سوال ہے ایسا کہنا غلط ہے کہ ایسی قواعدی ترکیب انگریزی زبان میں سنسکرت سے آئی ہے (اس سلسلے میں آکسفورڈ ڈکشنری کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے) واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری تراکیب کو بنیادی طور پر انڈو یوروپی زبان اور خصوصاً لاطینی سے لیا گیا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ زبان لاطینی سنسکرت کی مرہونِ منت ہے تو بقول غالب ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

جناب مجذوب صاحب کے مقالہ کے بقیہ حصہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ممدوح نے اشتقاق وغیرہ کے سلسلے میں جو بھی نتائج برآمد کیے ہیں وہ ان غلط مفروضات کی بنیاد پر کیے ہیں جن کی بدولت ان کے اعتبار سے سنسکرت جملہ 'حامی' زبانوں کا منبع رہی ہے۔ میں فونولوجی وغیرہ کے تکنیکی معاملات میں پڑنا نہیں چاہتا، اس سلسلے میں متعدد کتابیں موجود ہیں، جن کی ورق گردانی کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی میں لفظ 'پارس' اور 'ہندو' کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

میرا خیال ہے کہ جناب مجذوب اس امر سے ضرور واقف ہوں گے کہ لوہا (دھات) سب سے پہلے مشرق وسطیٰ اور ترکی کے اطراف میں منکشف ہوا تھا، چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ لوہا (غالباً) فر، فیرپز، پز، پیسر، پار وغیرہ کے نام سے میسوپوٹامیہ (عراق) سے ہوتا ہوا سندھ ہڑپا تہذیب کے ذریعہ زبانِ سنسکرت میں داخل ہوا (یوں آریائی قوم اپنے ساتھ لوہے کے اوزار و ہتھیار لائی تھی اور 'پارس' نام اختیار کر گیا۔ "رگ وید" میں موجود ہے

یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا لیکن ویدک سنسکرت ضرور ہے۔ جہاں تک 'فیرم' (لاطینی : Ferrum) کا سوال ہے قطعی ضروری نہیں کہ یہ لفظ 'پارس' کی لاطینی شکل ہے۔ قدیم فارسی میں 'پولاد' یا 'فولاد' موجود ہے۔ (اور یوں بھی 'پولاد' اور 'فیرم' میں مماثلت ہے، جس پر غور کیا جا سکتا ہے کہ 'فیرم' اپنی کسی ابتدائی شکل میں حیٹائیٹوی دنیا سے انڈو یوروپی اطالوی زبان میں داخل ہوا ہو) یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ 'فیرس' لفظ Ferrous یعنی : فولاد نما) ایک توصیفی اور ادبی لغت زبانِ انگریزی میں ہے۔ 'لوہا' کے لیے عام انگریزی لفظ 'آئرن' (iron) ہے جو کہ اولڈ انگلش میں Fsern / اور Isern (جس کا نعم البدل ڈچ میں Ijzer اور جرمن میں Eisen ہے) اور Iren ہے۔ کیا ہم 'Fsern' میں 'فولاد' کی جھلک دیکھ رہے ہیں؟ (یاد رہے ایسا سوچنا پورے طور پر سائنسی نہیں کہا جا سکتا ہے: اٹکل پچو لگانا اور باقاعدہ سائنسی طور پر اختراع کرنا قطعی الگ بات ہے)

لفظ 'ہندو' بہت ہی دلچسپ لغت یا اصطلاح ہے۔ عام طور پر اسے فارسی 'ہند' سے مخرج بتایا جاتا ہے جو کہ صحیح ہے۔

قدیم ایرانی میں 'ہندو' (Hindu) لفظ اس ہندوا (US. Handava) میں موجود ہے جو کہ قدیم ہندوستانی (کوئی ضروری نہیں کہ سنسکرت) 'سندھو' (Sin-dhu) سے آیا ہے، جس کے معنی 'بہتے پانی' (آب رواں) کے ہیں۔ 'سیان دتے' (Syandate) کے معنی 'وہ بہتا ہے' کے ہیں۔ چنانچہ سندھو کو 'پانی کے ذخیرے' سے بھی معنون کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ 'سمودرا' (Samudra) پھر سندھو ایک اسم تھا جو کہ ایک لفظ توصیفی میں لہجہ کی ذرا تبدیلی سے آیا چنانچہ سندھو (S indhu) نکلا ہوا لفظ ہے۔

جو کہ قدیم ہندوستانی 'ویندھو' (- Vindhu) بھیندو (- Bhindhu) اور 'کلیندو' (- Klindu) میں موجود ہے۔ یہ بات بھی ضروری ہے کہ جائے کہ 'سیندھو' (- Sindu) کی بنیاد 'سیدھ' اور سدھ (- Sedh اور - Sidh) ہے۔ 'سیدھ' کے معنی 'اونچا کرنے' کے ہیں، جیسے کہ باندھ کو اونچا کیا جائے۔ چنانچہ 'سندھو' کے معنی ہوئے: 'اونچے باڑھ کا احاطہ' (جیسے کہ اندوختہ پانی کے گرد باندھ بنا کر تالاب بنایا جاتا ہے) اور جس کے معنی یہ ہوئے کہ: پانی کا ایک ذخیرہ جسے گھاٹ بنا کر روک دیا جاتا ہے بعد میں اسے وسیع دریائے سندھ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ (ایرانی) اوستا زبان میں 'ہندو' کے معنی اوپر کو جاتی ہوئی بلندی ہے۔ دوسرے سارے معنی جو 'ہندو' سے نکالے گئے ہیں، انہیں صفتی کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہوا کہ قدیم ایرانیوں نے لفظ 'ہندو' کو ان قوموں کے لیے استعمال کرنا شروع کیا جو دریائے سندھ کی دوسری جانب (یعنی برصغیر میں) آباد تھے اور اسی اعتبار سے ان کے علاقے کو 'ہند' کہا گیا، جو کہ بعد میں 'ہندوستان' (ہندو + استھان/ آستان) کے نام سے مشہور ہوا، یعنی وہ ملک' علاقہ، رقبہ، جگہ جو کہ سندھ ندی کے دوسری جانب بسنے والی قوموں سے آباد ہے۔

جہاں تک 'ہندوتو' کا سوال ہے، یہ اصطلاح بنیادی طور پر جناب ساورکر کے ذریعہ ہندوستان میں جاری ہوئی ہے اور جسے کہ آر، ایس، ایس نامی جماعت نے جو کہ ایک 'خالص' قسم کی ہندو قومیت اور ہندو راشٹر کا پرچار کرتی ہے۔ اپنا لیا ہے۔ گو 'ہندو' ایرانی لفظ ہے' پر ہے 'سندھو' کا مفرس۔ یہاں میں ایک بنیادی امر کو واضح کر دوں: میرا یقین اوروں کی مانند ہے کہ ویدک آریائی شمالی و جنوبی مغربی

ایران اور کیس پی ان کے ملحقہ علاقوں سے ایران ہوتے ہوئے افغانستان اور شمالی مغربی ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان داخل ہونے سے پہلے اس آریائی قوم/ قبیلہ/ ایتھنک گروپ کے اندر تفریق ہوئی تھی۔ ایک گروہ دریائے سندھ پار کر گیا تھا، دوسرا ایران میں رہ گیا۔ اپنے اوریجنل علاقے سے وہ یوروپ میں بھی پھیلنے لگے۔ میں اس بات کو تاریخی/ علم انسانی/ عمرانی/ لسانی اعتبار سے صحیح نہیں سمجھتا کہ ویدک آریائی ہمیشہ ہمیش سے ہندوستان میں رہے ہیں، یہی ان کی ابتدا ہوئی، یہیں وہ مختلف قبائل میں منقسم ہوئے، یہیں انھوں نے سنسکرت زبان کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان ہی سے وہ دوسرے جغرافیائی علاقوں میں گئے۔ اس فکر کی غالباً سب سے عمدہ مثال ۴۰ صفحات کا وہ کتابچہ ہے جسے ایل' این رینو نے ترتیب دیا ہے۔ جس کا نام "Indian ancestors of vedic Aryans" (ویدک آریائی کے ہندوستانی اجداد) ہے اور جسے بھارتیہ ودیا بھون نے ۱۹۹۴ء میں شایع کیا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ: ویدک آریائی ہندوستانی تھے اور آریائی قبائل اور حملہ آور وسط ایشیا یا کسی اور دیار سے نہیں آئے تھے، کوئی آریائی قوم بھی (یس دیگر ہندوستانیوں سے مختلف نہ تھی۔ محض آریائی کلٹ (طریقہ فکر و روایت و رسوم) ضرور پیدا ہوا تھا، جو کہ ہندوستان ہی میں وجود میں آیا تھا۔ ان کی زبان کی بنیاد ہندوستانی تھی۔ ان کی ہندوستانی بولیاں ثقافتی طور پر اعلا تھیں، جنھوں نے سنسکرت کو صورت عطا کی۔

سر دست جہاں تک میں بتا سکتا ہوں مجھے ایسا نہیں لگتا کہ لفظ 'نماز' سنسکرت لغت 'نمستے' کا مفرس ہے۔ اب تک تو جہاں تک مجھے علم ہے کسی نے ایسی بات نہیں کہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ایرانی زبان میں مغرب (یعنی عراق) کی جانب سے آیا ہے۔ اب تک عربی و ایرانی

الفاظ کا تاریخی تعین ٹھیک طور پر نہ ہو پایا ہے۔ قرآن کریم میں غیر عربی الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ایرانی زبان میں عکاذی اور آرامی لغت خوب ہیں۔ چونکہ جناب مجذوب ثبوت پیش نہیں کرتے، اس لیے نماز کو 'نمستے' کی بگڑی ہوئی شکل کہنا فی الحال جائز نہیں ہے گا۔

موجودہ مضمون کے اس دوسرے حصہ میں کوشش کی جائے گی کہ زبان/بولی کے اس زبردست خاندان کا مختصر ذکر کر دیا جائے جس سے زبانِ سنسکرت منسلک تسلیم کی گئی ہے۔ اس بڑے گروپ کو انڈو یوروپی فیملی کہا جاتا ہے۔ جسے اس صدی کی معرکۃ الآرا تحقیقات کی وجہ سے انڈو حیطاطولی (Indo-Hittee) بھی کہتے ہیں۔ جرمنی میں پچھلی صدی میں اسے انڈو جرمن (Indo Germanisch) زبان بھی کہا گیا تھا جس کی بدولت انگریزی میں اسے اکثر انڈو جرمن کہا جایا کرتا تھا۔ انڈو یوروپی زبان۔ جو کہ اب کہیں بھی بولی نہیں جاتی (اگر اس کی ایک قسم بولی جایا کرتی تھی) گو اس کے ناقابلِ تردید آثار اس فیملی کی ساری زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑے خاندان کا نام ہے جس کے متعلق اندازہ ہے کہ کوئی ... ۱ ق،م تک یوروپ اور ایشیا کے جنوب مغرب اور جنوبی ایشیا میں بولی جایا کرتی تھی (میں اس زبان کو زیادہ تر کتابی یا تحریری سمجھتا ہوں۔ روزمرہ کی بولیاں گو اس سے منسلک پر الگ ہوں گی) اس خاندان کی مختلف زبانیں اور بولیاں بعد میں دنیا کے مختلف آباد علاقوں میں پھیل گئیں اور ان میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

انڈو یوروپی خاندان کی دس شاخیں معلوم ہیں:

۱۔ اناطولوی (Anatolian) جو کہ اب مکمل طور پر متروک/مردہ ہو چکی ہے۔ یہ زبان دوسرے اور پہلے ہزار سال ق،م میں ان علاقوں میں جسے اب ایشیائی ترکی اور شمالی شام کہتے ہیں، بولی/لکھی جایا کرتی تھی۔ اس شاخ کی اہم ترین زبان حیطاطوی (Hittite)

ہے، جو کہ دوسرے ہزار سال ق،م میں موجود تھی اور جس پر اس صدی میں تحقیق کے دوران انڈو یوروپی خاندان کے متعلق بیش قیمت انکشافات ہوئے ہیں۔

۲۔ انڈو ایرانی، اس شاخ کی دو ذیلی شاخیں ہیں: انڈو آریائی (یا انڈک Indo-Aryan or Indic) اور ایرانی (اسے 'فارسی' کہنا مناسب نہ رہے گا)۔ انڈو آریائی شمالی اور مرکزی ہندوستان اور پاکستان میں ... ۱ ق،م سے پہلے بولی جاتی تھی۔ اس کی سب سے عمدہ مثال ویدک سنسکرت کی مقدس کتاب "رگ وید" ہے جو کہ ۱۵۰۰-۱۰۰۰ ق،م میں تحریری کی صورت میں جمع کی گئی تھی (غالباً ویدک سنسکرت کبھی بھی روزمرہ کی زبان نہیں رہی، لکھی جاتی تھی، مذہبی مواقع پر استعمال میں آتی تھی) جدید انڈو آریائی زبانیں ہندی، بنگالی، اردو، سنہالی، مراٹھی، رومنی وغیرہ ہیں۔

ایرانی زبانیں پہلے ہزار سال ق،م میں موجودہ ایران اور افغانستان میں اور جدید ہنگری سے لے کر چینی ترکستان تک بولی جاتی تھیں۔ غالباً چند ایرانی زبانیں عام بولی میں مستعمل نہیں تھیں، لکھنے اور مذہبی مواقع پر استعمال کی جاتی تھیں۔ عربوں کے ایران میں داخل ہونے کے بعد ایرانی زبانوں میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ قدیم ایرانی صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئی۔ جدید فارسی ظہور میں آئی، جس پر زبانِ عربی کا گہرا اثر پڑا۔

۳۔ یونانی، یہ زبان اپنی مختلف بولیوں کے ساتھ یونان میں ..۱۶ ق،م سے بولی جاتی رہی ہے، بلکہ غالباً تیسرے ہزار سال ق،م کے آخری دور سے۔ اس کا قدیم ترین ٹکسٹ مینووی سطری بی کتبات (Minoan Linear B Tablets) ہیں، جو کہ ..۱۴ ق،م سے تحریری ضابطے میں آنے لگے تھے۔

۴۔ اطالوی، بنیادی زبان لاطینی ہے، جس کی ابتدا روم شہر میں ہوئی تھی۔ اس کے

ابتدائی تحریری نمونے چھٹی صدی ق، م سے ملنے لگتے ہیں اور لٹریچر کے خدوخال تیسری صدی ق، م سے متعین ہونے لگتے ہیں۔

۵۔ المانوی (Germanic) پہلے ہزار سال ق، م میں جرمن قبائل جنوبی اسکنڈی نیویا اور شمالی جرمنی میں جنوبی میدانوں سے داخل ہونا شروع ہو گئے تھے اور دوسری صدی ق، م سے ان کے آثار واضح طور پر ملنے لگتے ہیں، قدیم ترین جرمن زبان گوتھک ہے جو کہ چوتھی صدی عیسوی سے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس شاخ کی جدید زبانیں انگریزی، جرمن، ڈچ، ڈینش، سوئ ڈش، ناروبجنی اور آئس لنڈری ہے۔

۶۔ اس خاندان کی ایک اہم زبان توخاریینوی (To charian) رہی ہے، جو اب معدوم ہے اور جو کہ اول ہزار سال عیسوی کے دوران چینی ترکستان میں بولی جاتی رہی تھی۔ اس کی دو مخصوص ذیلی شاخیں A، یعنی ترفانیوی (Tarfanian) اور B، یعنی کوچینیوی (Kuchenian) ہیں۔

۷۔ کیلٹک (Celtic) عیسائی عہد کے فوراً قبل کی یہ پھیلی ہوئی زبان یورپ کے بڑے علاقے میں اسپین اور برطانیہ سے لے کر بلقان تک بولی جاتی تھی۔

بقیہ تین اہم شاخیں مندرجۂ ذیل ہیں:

۸۔ بالٹوسلاوکی (Balto-Slavic)

۹۔ آرمینیوی (Armenian)

۱۰۔ البانوی (Albanian)

انڈو یوروپی زبان کی ساخت، نحو قواعد، ابتدا اور ارتقا، مختلف لغات میں آپسی تعلق وغیرہ وغیرہ کی بابت جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس خاندان کی کسی ایک

زبان کو باقاعدہ سمجھنے کے لیے سارے خاندان سے واقفیت لازمی ہے۔ مزید یہ کہ انڈو یوروپی زبانیں بنیادی طور پر اپنی بنیادی لغت و فرہنگ میں بہت سارے الفاظ تقریباً مشترک رکھتی ہیں اور خاص طور پر اپنے نحوی لواحق میں، جس کی مخصوص وجہ ان کا ایک بنیادی زبان سے برآمد ہونا ہے۔

۱۸۱۶ء میں ولیم جونز کے کارناموں کے بعد جرمن محقق فرانز بوپ (Bopp) نے سنسکرت کا مقابلہ لاطینی، یونانی، فارسی اور مختلف جرمن زبانوں سے کیا۔ دو سال بعد ڈینیش زبان داں رسک (Rask) نے ان زبانوں کی ابتدا پر بحث کی۔ ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان بوپ نے جملہ انڈو یوروپی زبانوں کے تقابلی گریمر کا اجرا کیا۔ دیگر اہل علم نے بھی ان معاملات پر غور کیا۔ لیکن ان کی تحریریں اور اصول تقریباً متروک ہو گئے جب کہ ۱۸۷۰ء کی دہائی میں نئے انکشافات کیے گئے، خصوصاً جب یہ دیکھا گیا کہ مخصوص آوازوں پر جب تک پوری طرح غور نہ کر لیا جائے الفاظ کو سمجھنا اور ان کے آپسی رشتوں کو مخصوص لسانی ماحول میں جاننا دشوار ہوتا ہے۔ ایک مثال یوں ہوگی: یہ کہ گوتھک کا حرف 'ð' (ڈ) جو کہ لفظ Fader (باپ) میں ہے اور حرف 'þ' (پ) جو کہ لفظ Bropher (برادر) میں ہے، حرف 't' (ٹ)، کے ہم آواز ہے جو کہ سنسکرت میں لفظ Pitar یونانی میں Pater میں گوتھک 'ð' کے مساوی ہے۔ اسی طرح 'þ'، سنسکرت میں لفظ Bhratar اور یونانی کے لفظ Phrater (قبیلہ کا ایک فرد) میں ہے۔ یعنی:

Fadar : GK. Pater, Sans. Pitar   Bropher : GK. Phrater

Sans Bhratar

یوں ان جملہ زبانوں کے الفاظ کے عمیق مطالعہ سے ایک دوبارہ ساختہ جد(ِ زبان) کا انکشاف ہوا، جسے کہ ابتدائی انڈو یوروپی (Proto-Indo-European) کہا گیا۔ پھر پتہ چلا کہ حیطاطی زبان میں اکثر حرف h موجود ہے (جس کا تلفظ غالباً جرمن ch (جیسے کہ لفظ ach میں یعنی خ) کے برابر ہے، جس کا رشتہ اس ابتدائی/عنصری زبان سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اس پروٹو انڈو یوروپی زبان کی فرہنگ کے متعلق واقفیت بہت کم ہے۔ ذیل کے گوشوارے میں چند الفاظ کی فہرست دی جاتی ہے:

گھوڑا = ekwo   کتا = Kwo na

گائے = go'w   بھیڑ = He'wi

رتھ، گاڑی = wo'gh   سور = Sutt

گاڑی پہیے کے ساتھ، پہیہ = Keklo

(یعنی انگریزی mead) شراب = medhu   melit

سو تک کے اعداد = Kmtom

پر مشکل یہ رہی ہے کہ وقت اور مقام کا تعین کرنا سخت دشوار رہا ہے (بال گنگادھر تلک نے آریائی قوم کا اصلی وطن قطب شمال بتایا تھا جو کہ غلط ہے) اتنا تو بہر حال طے ہے کہ سب سے پہلے اناطولی، انڈو ایرانی اور یونانی اپنی جدی (پروٹو) زبان سے علیحدہ اور مختلف ہوتی چلی گئیں۔ پر ایسا کہنا غالباً درست رہے گا کہ اس پروٹو زبان کی پیدائش یوریشیا کے وسیع میدان میں ہوئی، جہاں مختلف "آریائی" قبائل ظہور میں آئے تھے۔ جہاں تک وقت کا تعلق ہے، ایسا کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان کوئی ...۳۰ ق،م کے عین قبل وجود میں آئی تھی۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وسیع علاقے میں ایک مخصوص کلچر ...۴۔...۳ ق،م

کے دوران وجود میں آچکا تھا، جسے کُرگان دوئم (Kurgan II) کہا گیا ہے اور جو کہ رفتہ رفتہ مشرقی یوروپ وسطیٰ سے شمالی ایران تک ..۳۵۔...۳ ق،م کے درمیان پھیل گئی اور جسے کُرگان سوئم کہا گیا ہے۔

پروٹو انڈو یوروپی زبان (جو کہ غالباً مختلف بولیوں کا ملغوبہ تھا) دھیرے دھیرے مختلف شاخوں میں بٹنے لگی، جس کی اہم شاخیں انڈو ایرانی، بالٹو سلاوکی، آرمینیوی اور البانوی ہوئیں۔ ایسا واقعہ کوئی ...۳ ق،م تک ظہور میں آنے لگا تھا۔

انڈو آریائی اور ایرانی زبانیں مل کر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انڈو ایرانی شاخ کہلاتی ہے (اور اب پروٹو زبان انڈو یوروپی ہو چکی تھی)، قدیم فارسی (جس کی متعدد قسمیں ہیں) اول اخامینیوی سلطنت کی سرکاری زبان میں شامل دکھائی دیتی ہے۔ مگدھ کا بادشاہ اشوک (تیسری صدی ق،م) کی سلطنت کی سرکاری زبان کو درمیانی انڈو آریائی کہا گیا ہے۔ تب تک ویدک سنسکرت (جو کہ غالباً مذہبی زبان رہی تھی) کئی ایک روپ بدل چکی تھی اور اس کی ترقی حیرت انگیز طور پر تھی۔

ایرانی اور انڈو آریائی کے درمیان گہرا تعلق رہا ہے۔ انڈو یوروپی کے طویل اور خفیف مصوتے طویل اور خفیف a (الف) میں تبدیل ہو گئے، جیسے:

Sans menas دماغ، ذہن = Avest. manah

لیکن یونانی زبان میں manos کے معنی جوش اور قوت کے ہیں لیکن ایک دو اور مثال:

sans pitar باپ = GK pater Avest and old pers . pitar

sans yajna , قربانی = Avest. zaotar

sans . mitra , دیوتا متھرا = Avest. miotra

sans . arya , آریہ = Avest. airya old pers. ariya

sans. duhitr , دفتر = Avest. dageder duvder

sans. gabhiron , گہرائی = Avest . jafra

اس موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ ابتدائی کام زیادہ تر جرمن اور فرنچ زبانوں میں کیا گیا (جن کے انگریزی تراجم موجود ہیں)۔ یہاں محض چند اہم کتابوں کا حوالہ دیا جائے گا۔ سب سے پہلے دو اہم اور لازمی قاموسات:

Carl Darling Buck : A Dictionary of selected synonyms in the principle Indo-European Languages (1949)

R.L. Turner:A Compa rative Dictionary of the Indo- Aryan Languages (1966)

مزید چند اہم کتابیں جن کی زبان نسبتاً آسان ہے:

H. Birubaum and J. Puhvel, eds : Ancie, t Indo- European Dialects (1966)

G. Cerdona , H.M. Hoenigswald and A Senn, eds : Indo- Europeans and Indo- Europeans (1970)

E. Benveniste : Indo- Europeans Languages and Society (Eng.Trans 1973)

A . D .Lock Wood : A Panorama of Indo- European Languages (1972)

A . Meilett The Indo- European Dialects (Eng.Trans 1967)

بابُ التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر
اور
نئے رسالے

ماہنامہ الفرقان اشاعت خاص بیادگار مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مرتبہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، بہترین کاغذ وطباعت، با معنی وجاذب نظر سرورق، صفحات ۶۷۶، قیمت ۱۱۵ روپے، پتہ: ماہنامہ الفرقان ۳۱/۱۱۴، نظیر آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

گذشتہ سال مولانا محمد منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان کی وفات ہوئی تو محسوس کیا گیا کہ یہ قوم وملت کا زیان وحرمان ہے، ان کی داستان حیات دراصل کارزار زندگانی میں یقین محکم اور عمل پیہم کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ مولانا کی تدریسی وتصنیفی سرگرمیوں کا الگ باب ہے۔ معارف الحدیث کے علاوہ تیس سے زیادہ کتابیں اور رسالہ الفرقان کے بے شمار صفحات ان کے ان کمالات اور علمی وعملی خوبیوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ رسالہ الفرقان کی ادارت واہتمام اب ان کے لائق صاحبزادوں کے ذمہ ہے جنھوں نے اپنے پدر بزرگوار کے علمی وعملی مجاہدوں اور گوناگوں کارناموں کو روشن کرنے کے لیے یہ خاص نمبر بڑی محنت وجانفشانی اور سلیقے سے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ ۶۷۶ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر مولانائے مرحوم کے حالات وسوانح اور متنوع علمی وعملی کمالات کا مرقع ہے۔ رسائل وجرائد کے تعزیتی مضامین گلہائے تازہ، فکر نعمانی کی چند جھلکیاں اور خطوط وغیرہ مختلف

ابواب کے تحت ستر سے زیادہ مقالات و مضامین اور نظمیں یکجا کردی گئی ہیں۔ گو سب مضامین یکساں اور ایک ہی سطح کے نہیں ہیں تاہم بہت سارے متفرق و منتشر مواد کو اس میں اکٹھا کردیا گیا ہے۔ سوانحی مضامین میں مولانا کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا مضمون 'منزل بہ منزل' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں تجزیہ کا رنگ بھی شامل ہے، ایک جگہ لکھا گیا کہ "مولانا مرحوم مشاورت کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہونچ گئے کہ امت ہیں فی الحال اجتماعی کاموں کی صلاحیت دور دور تک نہیں ہے"۔ یہ تحریر خواہ مایوس کن ہو لیکن حقیقت پر مبنی ہے، ندائے ملت کے اجراء کے سلسلہ میں مولانا سنبھلی نے لکھا کہ "یہ زمانہ مولانا علی میاں کی رفاقت کا تھا"۔ حالانکہ دونوں بزرگوں کی رفاقت کی ابتدا اس سے قریب ربع صدی پہلے ہوگئی تھی، مولانا کے خطوط سے ان کی للہیت، سادگی، اور تواضع کی بڑی موثر تصویر سامنے آتی ہے، ان خوبیوں کے باوجود جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور ندوہ و دیوبند کے تدریسی و انتظامی مشاغل کے تعلق سے کسی قدر تشنگی کا احساس ہوتا ہے، ان موضوعات پر بھی سیر حاصل مضامین شامل کرنے کی ضرورت تھی، طباعت و تزئین اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن کمپیوٹر کے اغلاط سے یہ خاص نمبر خالی نہیں ہے۔

اشراق بیاد مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم، مدیر جناب معز امجد، عمدہ کاغذ اور بہترین طباعت، صفحات ۱۸۰، قیمت ۲۰ روپے، سالانہ ۱۲۰ روپے، پتہ: دانش سرا، ۱۲۳ بی، ماڈل ٹاؤن، لاہور، پاکستان۔

بلند پایہ عالم و ادیب، مفکر و مصلح اور صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کی وفات یقیناً دنیائے علم و فضل و دانش کا بڑا خسارہ و حرمان ہے، ان کی شخصیت اور کمالات علمی کی قدر و قیمت ان کے آثار و باقیات سے ظاہر ہے، لاہور کا ماہنامہ اشراق

مولانا کے کمالات افادات و فرمودات کا ایک نمایاں ترجمان ہے، توقع کے مطابق اس نے مولانا کے انتقال کے ذرا عرصہ بعد یہ خاص شمارہ ان کی یاد میں شایع کیا، جس میں مولانا کے تلامذہ و فیض یافتگان کے تاثرات، ان کی تصانیف کا تعارف، ان کے اقوال و خیالات نثر اصلاحی کے منتخب نمونے اور مولانا کی سرگزشت اور ان کا مفصل انٹرویو اس سلیقہ سے یکجا کیے گئے ہیں کہ یہ مستقبل میں مولانا مرحوم کے سوانح و افکار کے متلاشیوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا، ماہنامہ اشراق کے بانی جناب جاوید احمد غامدی اور جناب خالد مسعود پاکستان میں مولانا کے ممتاز تلامذہ اور ان کے کاروانِ فکر کے سرخیل ہیں، انکے مضامین میں قدرتاً جوش و اثر نمایاں ہے، اور اوصاف کے علاوہ مولانا مرحوم کو "اسلام کے دور جدید کا دوسرا عالم" اور "دبستان شبلی کا آخری نمائندہ" سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن بعض اور مضامین میں یہ جوش حد اعتدال سے سوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنے آبائی وطن اور مادر علمی سے کس قدر محبت تھی، چند سال پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں مولانا فراہی پر ایک عظیم الشان سمینار ہوا، مولانا کبر سنی اور خرابی صحت سے مجبور تھے، اس وقت ان کی نشستوں کی گفتگو صرف اعظم گڑھ اور مدرسۃ الاصلاح کی یادوں سے خاص تھی، اسی موقع پر انہوں نے فرمایا کہ اگر بھارت جاؤں تو وہاں بیک وقت مسرت انگیز اور غم انگیز واقعات کا ایسا ہجوم ہوگا جو میری برداشت سے باہر ہے۔ بعض مضامین میں مولانا کے شذوذ کا ذکر ہے جو عام لوگوں کے خلجان کا باعث ہوسکتا ہے۔

ماہنامہ سب رس محبوب حسین جگر نمبر مرتبہ جناب مغنی تبسم کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰، قیمت ۴۰ روپے، سالانہ ۱۲۵ روپے، پتہ: ادارہ ادبیات اردو،

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد اے پی، ۵۰۰۰۲۸۔

ہندوستان بلکہ برصغیر کی موجودہ اردو صحافت میں حیدرآباد دکن کا روزنامہ سیاست بہت نمایاں اور ممتاز ہے، اس کی بنا و ترقی اور اسے غیر معمولی عزت، شہرت اور مقبولیت بخشنے میں اس کے بانی مدیر جناب عابد علی خاں مرحوم کے شریک و سہیم اور خاص دست و بازو جناب محبوب حسین جگر بھی تھے جو ایک گوشہ گیر، خاموش اور نام و نمود سے بے نیاز شخص تھے۔ اس کی اور اپنے قلندرانہ مزاج کی وجہ سے ان کو شایانِ شان شہرت نہیں حاصل ہوئی لیکن حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں ان کی محبوبیت قابلِ رشک تھی، اسی کی ایک مثال ادارۂ ادبیات اردو کے ماہنامہ ترجمان کا زیرِ نظر خاص شمارہ ہے جس کے مضامین میں جگر مرحوم کی دلنواز اور بے لوث شخصیت کے مختلف پہلو روشن ہیں۔ حیدرآباد کی تہذیب میں ڈھلی اس شخصیت کے خاتمہ بالخیر کا ذکر ان کے برادر خورد اور ملک کے مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے ان الفاظ میں کیا ہے "...... اللہ پاک اللہ پاک، اس کے بعد انکی زبان بند ہوگئی، اللہ کو پکارنے کے بعد پھر انھوں نے کسی بشر سے بات نہیں کی"۔ ایک حصہ میں جگر مرحوم کے چند افسانے اور مضامین بھی یکجا کر دیے گئے ہیں، نظموں کے علاوہ چند اہم تصویریں بھی رسالہ میں شامل ہیں۔

سہ ماہی یہ صبح

مدیر جناب سید نوشاد علی، مرتب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۷۲، قیمت فی شمارہ ۲۵ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: ایڈیٹر سہ ماہی یہ صبح، ۴۹-II لین، جوہری فارم نور نگر ایکس ٹینشن، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵۔

دلی کے افق پر اردو کا تازہ ادبی مجلہ 'یہ صبح' کی صورت میں نمودار ہوا ہے، اس کے مرتب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ترقی پسند ادب کے نوجوان اور تازہ مدح و ثنا خواں ہیں، ان کے خیال میں ادب کو زندگی

سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا، اداریہ 'شفق' سے ان کے اعتدال اور وسیع المشربی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، رسالہ کی ترتیب میں حسنِ سلیقہ نمایاں ہے، بحث خیز، بازیافت، مقالے، مصاحبے، محاسبے اور افسانے جیسے ابواب کے علاوہ ترجمے بھی ہیں اور خالد سہیل کی ادبی شخصیت کے لیے علاحدہ گوشہ بھی خاص کیا گیا ہے، ادبی سماج کے عنوان سے ادبی خبر نامے کا رنگ بھی شوخ ہے بحث خیز میں سلمان رشدی کے متعلق ادے پر کاش نے لکھا ہے کہ ان کا کوئی بھی ناول فن کی کسی نئی چوٹی تک لے جاتا ہے نہ ناول کی ساخت میں کوئی نیا تخیل آمیز اور طبع زاد تعاون دیتا ہے، توقع ہے یہ مجلہ اردو کے نئے ادبی میلانات و رجحانات کی یافت و تعیین میں سازگار ثابت ہوگا۔

دوماہی مجلہ الفرقان

مدیر جناب مولوی عبدالمبین عبدالخالق ندوی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۸، قیمت ۲ روپے، سالانہ ۷۰ روپے، پتہ: دوماہی مجلۃ الفرقان، مرکز الدعوۃ الاسلامیہ، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر، یوپی ۲۷۲۱۸۹۔

یہ رسالہ قریب دو سال سے شایع ہو رہا ہے، علمی و مذہبی موضوعات پر مفید مضامین ہونے کی وجہ سے یہ برابر خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں ہے اسکے لائق مدیر خاص طور پر مستحق ستایش ہیں، جن کی اداریٰ تحریریں 'بینات' کے زیرِ عنوان جرأت مندانہ اور پُر از معلومات ہوتی ہیں، رسالہ عام پذیرائی اور قبولیت کا حقدار ہے۔

سہ ماہی الشارق

مدیر جناب مولوی حبیب الرحمن پروازؔ قاسمی، بہترین کاغذ اور عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۴۸، قیمت چھ روپے، سالانہ چوبیس روپے، پتہ: ایڈیٹر الشارق، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ۔ یوپی ۲۷۶۳۰۲۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی قایم کردہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور نے مختصر عرصہ میں تعمیری و تدریسی دونوں لحاظ سے تیزی سے ترقی کر کے اکابر کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لی ہے اب زیرِ نظر رسالہ کی شکل میں اس کا علمی و اصلاحی ترجمان بھی شایع ہوگیا ہے، توقع ہے کہ اس کا افادہ بھی عام ہوگا۔

ع۔ص۔

مطبوعات جدیدہ

شعراء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

از جناب مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی

بڑی تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۵۷۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ، یوپی۔

حضرات صحابۂ کرامؓ میں متعدد بزرگ قادر الکلام شاعر تھے، لیکن خصوصیت سے حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، کعب بن زہیر اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو اس میدان میں بڑا ممتاز و نمایاں درجہ حاصل تھا۔ زیر نظر کتاب میں ایک ہندوستان نژاد عربی زبان کے مشہور و ماہر اہل قلم البعث الاسلامی کے فاضل اڈیٹر اور ندوۃ العلماء کے شعبۂ عربی ادب کے لائق استاد مولانا سعید الاعظمی صاحب نے مذکورہ بالا شعراء کے مطالعہ و تحقیق کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس انتخاب میں ایک وجہ مشترک یہ بھی ہے کہ ان شعراء نے جاہلیت و اسلام دونوں زمانوں میں مشق سخن جاری رکھی، اس طرح اسلام اور ما قبل اسلام کے شعری پیرایہ و اسلوب اور معانی و مفاہیم کے فرق و تغیر کے جائزے اور تجزیے کا فریضہ فاضل مصنف نے بحسن و خوبی انجام دیا، پانچ سو ستر صفحات کی اس ضخیم عربی تالیف میں فطری طور سے حضرت حسان بن ثابتؓ کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے، جن کی شاعری میں مدح و ہجو، مرثیہ و معذرت اور تغزل کی جملہ خصوصیات کے علاوہ اخلاقی مضامین اور اسلام کی جانب سے دفاع کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ فنی لحاظ سے جدت استعارہ، لطافت اشارہ و کنایہ، وزن و قافیہ کا عمدہ انتخاب اور قلت مبالغہ وہ محاسن شعری ہیں جن سے

شعرائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مرصع و مزین ہے، کتاب میں قریباً ہر پہلو سے ان کا اظہار ہے، اصل مراجع و مآخذ سے سوانح و کلام کو یکجا کیا ہے، یہ کتاب دراصل ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، بجا طور پر اس کی داد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مقالہ کے نگراں اور ندوہ کے ادیب اول مولانا محمد رابع حسنی کے قلم سے شامل کتاب ہے۔

اقبال اور ظفر علی خاں

از جناب جعفر بلوچ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۶، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور پاکستان۔

اردو ادب میں اقبالیات نے اب ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے جس میں ہم ذوق و ہم عصر شخصیات کے مطالعہ و موازنہ کا دلچسپ باب بھی شامل ہو گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک مفید و دلچسپ کڑی ہے جس میں برصغیر میں اس صدی کے اوائل کی دو اہم اور ممتاز شخصیتوں کے تعلق کے پس منظر میں اس پُر آشوب دور کے قومی و ملکی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ لائق مولف کو احساس ہے کہ شخصیات کے مطالعہ کے اس انداز سے ان سے متعلق معلومات میں افزونی کے علاوہ ان کے مرتبہ و مقام کی تعیین بھی بہتر صورت میں ہو جاتی ہے، اسی لیے انہوں نے علامہ اقبال و مولانا ظفر علی خاں کے باہمی ربط و تعلق، قومی مسائل کے بارے میں ان کا نقطہ نظر اور بعض امور میں اتحاد و عدم اتفاق کی داستان مستند تحریروں کی روشنی میں بیان کی ہے، اس سلسلہ میں بعض مشکل و سخت مراحل سے بھی وہ خوبی سے گزرے ہیں، ایک جگہ اکابر کی تحریروں میں تحریف کی دانستہ کوشش کے متعلق ان کے قلم میں شدت آگئی ہے جیسے مظفر حسین برنی کی مرتبہ کلیات مکاتیب اقبال کے ایک خط کے متعلق جہاں اس کے

ترجمہ کو غلط اور مغالطہ آمیز بتایا ہے لہجہ سخت ہوگیا ہے آخر میں چند ضمیمے بھی شامل ہیں۔ جن میں مولانا ظفر علی خاں کے نام علامہ اقبال کے خطوط اور علامہ کے متعلق مولانا مرحوم کی نگارشات یکجا کیے گئے ہیں، اس سے کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔

اظہر حسین مرحوم ایک تہذیب ایک شخصیت از جناب ڈاکٹر انور حسین خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۱۱۰، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: اخلاق حسین خاں نیورہ، بارہ بنکی، یوپی ۲۲۵۴۰۶۔

اودھ مرحوم کی تہذیب وثقافت اصلاً نرم خوئی، بذلہ سنجی، شگفتگی، شائستگی، وضعداری مہمان نوازی اور حفظ مراتب کی بے شمار داستانوں سے عبارت ہے، ماضی قریب میں جب یہ اپنے آخری دور سے گزر رہی تھی اس وقت بھی اس کے خاکستر کی کچھ چنگاریاں ماحول کو روشن و منور کررہی تھیں، اس کتاب میں بارہ بنکی کی ایک ایسی ہی شخصیت جناب اظہر حسین مرحوم رئیس نیورہ کے سوانح جمع کر دیے گئے ہیں، جو اسی تہذیب کا خوبصورت نمونہ تھے، شہرت سے دور لیکن اہل علم و فضل میں محترم و مقبول تھے، ان کے لائق و سعید صاحبزادے نے اچھا کیا کہ ان کے پاکیزہ احوال و اطوار کو جمع کرکے ضایع ہونے سے بچالیا، اسلامی ہند کی تاریخ میں اس قسم کے تذکروں کی خاص افادیت ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ع۔ص۔